

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مضامین کا مجموعہ

مقالات حکیم

جلد اول : اسلامیات

مترتبہ

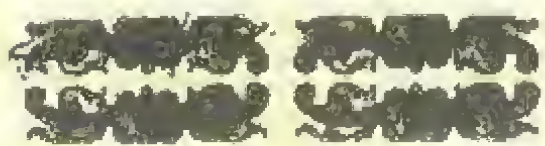
شاہد حسین رزاقی

ادارہ ثقافت اسلامیہ

کلب روڈ - لاہور - پاکستان

پاکستان کے نامور مفکر اور بلند پایہ مصنف ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نہایت دقیق مسائل اور مشکل موضوعات پر عام فہم انداز اور سادہ الفاظ میں اظہار خیال کرنے پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ اسلامیات، فلسفہ اور اقبالیات پر ان کی نظر نہایت وسیع تھی اور علمی حلقوں میں ان کی تصانیف بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ کتابوں کے علاوہ خلیفہ صاحب نے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں مضامین بھی لکھے جن کا مطالعہ ان کے افکار و نظریات سے پوری طرح باخبر ہونے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ ادارہ ثقافت اسلامیہ نے ان کے اردو اور انگریزی مضامین اور تقاریر شائع کرنے کا ایک جامع پروگرام بنایا ہے۔

خلیفہ صاحب کے اردو مضامین تین جلدوں میں ”مقالات حکیم“ کے نام سے شائع کیے گئے ہیں۔ پہلی جلد میں اسلامیات اور دوسری میں اقبالیات سے متعلق مضامین ہیں اور تیسری جلد متفرق مضامین و تقاریر پر مشتمل ہے۔ پیش نظر کتاب اس سلسلہ کی پہلی جلد ہے جس میں اسلامی تعلیمات اور اسلام کے سیاسی، اقتصادی اور معاشری تصورات پر فکر انگیز مقالات شامل کیے گئے ہیں۔ خلیفہ صاحب اس نظریہ کے حاسی تھے کہ اسلامی افکار کی از سر نو تشکیل کر کے اسلام کی اساسی قدروں اور عصری تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے اور اسلام کے عالمگیر اور ترقی پذیر اصول ساری دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیے جائیں کہ اسلام ایک ساکت اور جامد مذہب نہیں بلکہ ایک متحرک دین اور حیات بخش قوت ثابت ہو۔ اس بنیادی مقصد کو انہوں نے اپنے مضامین میں بھی پوری طرح ملحوظ رکھا ہے جو ان کے علمی تبصرے، خدا داد ذہانت اور معنی آفریں صلاحیت کے آئینہ دار ہیں۔



مقالہ حکیم

جلد اول

اسلامیات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے مضامین کا مجموعہ

مرتبہ

شاہد حسین زرقی

ادارہ ثقافت اسلامیہ

کلب روڈ لاہور

طبع اول

۱۹۴۹

تعداد

ایک ہزار

طابع و مطبع

حمایت اسلام پبلیشنگ لاہور

ناشر

محمد اشرف ڈار، سکریٹری ادارہ ثقافت اسلامیہ

کلب روڈ - لاہور

تعارف

پاکستان کے نامور فلسفی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم بلند پایہ مصنف، صاحب طرز ادیب، خوش بیان مقرر، خوش گوشتاعر اور روشن خیال مفکر تھے۔ اور ان کے افکار و نظریات پاکستان کے مسلمانوں کی فکری تاریخ کا ایک اہم باب بن گئے ہیں۔ خلیفہ صاحب اپنے عہد کے فہم ترین افراد میں سے تھے۔ وہ اپنے ہم عصروں میں ہمیشہ ممتاز رہے اور عمر کے آخری بھی سالی میں جو ان کی زندگی کا اہم ترین دور ثابت ہوئے ان کے قلم کے جہر کھلے اور انھوں نے روشن خیالی مفکر بن گئے تھے۔

خلیفہ صاحب کشمیری تبار تھے۔ جن کی تاریخ ۱۸۹۲ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ اور اسی شہر میں میٹرک تک تعلیم پائی۔ پھر علی گڑھ چلے گئے اور ۱۹۱۳ء میں ایف۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی میں داخل ہوئے۔ کیونکہ ان کو فلسفہ سے غیر معمولی دلچسپی ہو گئی تھی اور اس کالج میں اس مضمون کی تعلیم کا اچھا انتظام تھا۔ بنی۔ اسے اور ایم۔ اے کے امتحانوں میں وہ پنجاب یونیورسٹی میں آؤں رہے اور ان کی تداراد و صلاحیتیں ایک تابناک مستقبل کی نشاندہی کرنے لگیں۔ ۱۹۱۴ء میں ایم۔ اے کرنے کے بعد لاہور واپس آئے اور ایل ایل بی کی سند حاصل کر لی لیکن وکالت سے انھیں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اور وہ ایسے کام کی تلاش میں تھے جو ان کے فطری رجحان کے مطابق ہو۔ یہ کام ان کو جلد ہی مل گیا۔ حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی اور اگست ۱۹۱۵ء میں خلیفہ صاحب فلسفہ کے مددگار پروفیسر کی حیثیت سے اس یونیورسٹی سے منسلک ہو گئے۔ حیدرآباد میں ملازمت شروع ہونے کے دو سال بعد ہی وہ تعلیمی رخصت سے کرپڑے۔ کچھ عرصہ میڈل برگ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر ۱۹۲۵ء میں جب حیدرآباد واپس آئے تو ان کو یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر اور صدر شعبہ بنا دیا گیا۔ حیدرآباد میں خلیفہ صاحب تیس سال رہے۔ ۱۹۴۲ء میں طویل رخصت سے کرپڑے۔ کچھ عرصہ جہاں وہ ہمارا جہ کالج کے پرنسپل اور

پھر محکمہ تعلیم کے ناظم مقرر ہو گئے تھے۔ وہ سر ینگر میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن وہاں کے حالات سے مطمئن نہ ہو سکے۔ چنانچہ ۱۹۴۶ء میں پھر حیدرآباد واپس آ گئے۔ اور یونیورسٹی میں میرٹھ شعبہ فنون مقرر ہوئے۔

۱۹۴۶ء میں خلیفہ صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو کر پاکستان آ گئے۔ یہاں انھوں نے ۱۹۵۰ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم کیا اور آخر وقت تک اس کے ڈائریکٹر رہے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ خلیفہ صاحب کی نظر میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا اور انھوں نے اپنی فکری و علمی صلاحیتیں اس ادارے کے لیے وقف کر دی تھیں۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ اسلامی افکار کی از سر نو تشکیل کر کے اسلام کی اساسی قدروں اور عصری تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اور اسلام کے عالمگیر اور ترقی پذیر اصول ساری دنیا کے سامنے اس طرح پیش کیے جائیں کہ اسلام ایک سادہ و جامد مذہب نہیں بلکہ ایک متحرک دین اور حیات بخش قوت ثابت ہو۔ یہی وہ مقصد تھا جس کے لیے انھوں نے یہ ادارہ قائم کیا تھا۔ اور اسی مقصد کو انھوں نے اپنی تصانیف میں ملحوظ رکھا۔

پاکستان کی علمی، ادبی، ثقافتی، دینی اور معاشرتی سرگرمیوں میں خلیفہ صاحب ہمیشہ نمایاں حصہ لیتے رہے۔ پاکستان فلاسفیکل کانگریس قائم کی اور اس کے صدر ہوئے۔ تنظیمِ زکوٰۃ کمیٹی کے صدر اور عائلی کمیشن کے ممبر میٹری مقرر کیے گئے۔ علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں میں کاتھولک تعلقی رہا اور ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں پنجاب یونیورسٹی نے ۱۹۵۷ء میں ایل ایل۔ ڈی کی اعزاز سی ڈگری دی۔

موجودہ زمانہ میں بیشتر اکیٹ نے عالمگیر مقبولیت حاصل کر لی ہے اور ہر ایسے نظامِ حیات کے لیے جو خدا پر ایمان رکھتا ہے اور روحانی اقدار کا قلعہ کل سے استقامت کو ایک خطرہ تصور کیا جانے لگا۔ چنانچہ امریکہ میں عالمی برادری اور مسلم سچی، غاوی کی تحریکیں اس فرقے سے شروع کی گئی ہیں کہ ملک، مذہب، ملت، رنگ اور زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر تمام انسانوں کو ایک پیٹ فارم پہنچایا جائے۔ اور اشتراکی مادہ پرستی اور لادینی کا مقابلہ کرنے کے لیے خدا پرست مذہب کے ماننے والے متحد ہو جائیں۔

خلیفہ صاحب ان تحریکوں کے حامی تھے۔ چنانچہ ۱۹۵۲ اور ۱۹۵۶ء میں وہ لبنان میں ہونے والے بین الاقوامی مذاکروں میں شریک ہوئے۔ اور ۱۹۵۲ء اور ۱۹۵۶ء میں امریکہ، کینیڈا اور یورپ کے متعدد ممالک کے دورے کر کے ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی جو اہل کلیسا کی تنگ نظری اور صلیبی جنگوں کی وجہ سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان ایک دوسرے کے مذہب کے بارے میں پیدا ہو گئی ہیں۔ ۱۹۵۸ء میں خلیفہ صاحب دانشوروں کی عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے آسٹریلیا بھی گئے تھے۔ ۱۹۵۹ء میں کراچی میں بین الاقوامی اسلامی مجلس مذاکرہ منعقد کی گئی تھی۔ خلیفہ صاحب اس کے ایک اجلاس کی صدارت کے لیے کراچی گئے تھے۔ اور وہیں ۳۰ جنوری کو انہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔

کم و بیش چالیس سال تک خلیفہ صاحب تصنیف و تالیف کے کام میں مصروف رہے، اور عمر کے آخری دس سال ان کی علمی زندگی کا بہترین دور تھے۔ حیدر آباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو زبان و ریاضۂ تعلیم تھی۔ اور اعلیٰ جماعتوں کی تعلیم کے لیے اردو میں مختلف مضامین کی کتابوں کی فراہمی ایک اہم مسئلہ تھا۔ چنانچہ دوسری زبانوں سے عمدہ کتابوں کا ترجمہ کر اسنے پر خاص توجہ کی گئی۔ اس کام میں خلیفہ صاحب نے نمایاں حصہ لیا۔ اور ویسیر کی ہسٹری آف فلاسفی (تاریخ فلسفہ) ہیرالڈ ہوڈنگ کی ہسٹری آف ماڈرن فلاسفی (تاریخ فلسفہ جدید)، اور ایڈورڈ زیلر کی آفٹ لائن آف گریک فلاسفی (مختصر تاریخ فلسفہ یونان) کا ترجمہ کیا۔ تراجم کی فہرست میں ولیم جیمز کی مشہور کتاب کا ترجمہ بھی شامل ہے جو ۱۹۵۸ء میں تصانیف و اردات روحانی کے نام سے شائع ہوا۔ ان کتابوں کے علاوہ خلیفہ صاحب نے بھگوت گیتا کا منظوم ترجمہ بھی کیا تھا۔ حیدر آباد میں قیام کے دوران خلیفہ صاحب نے داستان دانش کے نام سے فلسفہ کی سرگزشت و پیرپ انداز میں لکھی تھی جو ان کی انشا پر وازی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

خلیفہ صاحب کی تصنیفی زندگی کا بہترین دور پاکستان آنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں

مشرع ہوا اور دس سال تک جاری رہا۔ اس دور کی نہایت اہم کتاب اسلامک آئیڈیالوجی ہے جس میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو جدید افکار کی روشنی میں واضح کیا گیا ہے اور اسلامی نظریہ حیات کا دوسرے نظام ہائے فکر سے مقابلہ کر کے دعوت فکر و نظریہ کی گئی ہے اور مسلمانوں کو اسلام کی حقیقی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی تلقین کی گئی ہے۔ خلیفہ صاحب کی دوسری مشہور انگریزی تصنیف اسلام اینڈ گورنمنٹ ہے جس میں انھوں نے اسلامی اور اشتراکی نظریات کا تقابلی مطالعہ اور تجزیہ کر کے اسلام کو مسلک اعتدال ثابت کیا ہے اور اس کے نظریات کی خصوصیات واضح کی ہیں یہ دونوں کتابیں ادارہ ثقافت اسلامیہ سے شائع کی ہیں۔

مولانا جلال الدین رومی سے خلیفہ صاحب کو گہرا شغف تھا۔ ۱۹۱۷ء میں ایم۔ اے کے لیے اس موضوع پر مقالہ لکھا تھا اور ۱۹۲۲ء میں پی ایچ۔ ڈی کے لیے بھی میٹا فرس آف رومی کے عنوان سے مقالہ پیش کیا تھا جو ۱۹۲۳ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ادارہ ثقافت اسلامیہ سے ۱۹۵۳ء میں حکمت رومی اور ۱۹۵۹ء میں تشبیہات رومی دو کتابیں شائع ہوئیں۔ حکمت رومی میں خلیفہ صاحب نے رومی کے افکار و نظریات کی روحانی و فکری اہمیت پر سے دلکش انداز میں بیان کی ہے۔ اور تشبیہات رومی میں انھوں نے رومی کے افکار کو تشبیہ و تمثیل کے آئینہ میں دیکھا ہے اور اخلاقی و روحانی مسائل کو سمجھانے کے لیے رومی کی یقین آفرین تشبیہات کے تخلیقی و روحانی پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

خلیفہ صاحب میرزا غالب کے بڑے قدر شناس تھے اور افکار غالب کو انھوں نے غالب کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر حکیمانہ بحث کی اور اس کے فلسفیانہ افکار کو سچا رخ میں منظر پر میں مربوط طریقہ سے پیش کر کے اسے ایک نظام فکر کی شکل دینے کی کوشش کی۔

عصر حاضر کے عظیم ترین شاعر اور مفکر علامہ اقبال کے حکیمانہ انداز فکر، حسن

بیان اور نظریات سے خلیفہ صاحب بے انتہا متاثر تھے۔ اور ان کی مشہور تصنیف فکر اقبال اس موضوع پر ایک مستند ترین کتاب ہے۔ اس میں اقبال کی شاعری اور فلسفہ کے تمام پہلوؤں پر فکر انگیز بحث کی ہے اور اقبالیات میں یہ گراں قدر اضافہ اردو ادب کو خلیفہ صاحب کا پیش ہاتھ ہے۔

خلیفہ صاحب اعلیٰ درجہ کے مفکر اور دانش ور تھے۔ بہت جلد بات کی تہ کو پہنچ جاتے تھے۔ پیچیدہ مسائل اور مشکل موضوعات پر عام فہم انداز اور سادہ الفاظ میں اظہار خیال پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے۔ نہایت دقیق فلسفیانہ مسائل پر گفتگو کرتے وقت ان کی تہذیب و ذہانت اور معنی آفریں صلاحیت کے جوہر کھلتے تھے۔ ان کا ادبی ذوق نہایت پاکیزہ تھا۔ اردو اور فارسی ادب سے ان کی دلی لگاؤ تھا اور انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادب پر بھی ان کی نظر بہت وسیع تھی۔ ان کی یہ خوبیاں اور علم و فضل کی وسعت و گہرائی ان کی تصانیف میں نمایاں نظر آتی ہیں۔

کتابوں کے علاوہ خلیفہ صاحب نے مختلف موضوعات پر بڑی تعداد میں مضامین لکھے اور تقریریں بھی کیں جن کا مطالعہ ان کے اذکار و نظریات سے پوری طرح باخبر ہونے کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ ادارہ ثقافت اسلامیہ دہلی نے ان کے اردو اور انگریزی مضامین و تقاریر اور ان کا مجموعہ کلام شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اردو مضامین مقالات حکیم کے نام سے تین جلدوں میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ پیش نظر کتاب اس سلسلے کی پہلی جلد ہے اور اسلامیات سے متعلق مضامین اس مجموعہ میں شامل کیے گئے ہیں۔ دوسری جلد اقبالیات سے متعلق ہے اور تیسری جلد متفرق مضامین وغیرہ پر مشتمل ہے۔ ان تین جلدوں کے علاوہ انگریزی مقالات کا ایک مجموعہ بھی شائع کیا جا رہا ہے اور ان کے کلام کا مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے۔ یہ دونوں کتابیں جلد ہی شائع ہو جائیں گی۔ پیش نظر مجموعہ میں جو مضامین ہیں وہ زیادہ تر ادارہ کے ماہرین نے ثقافت کے لیے لکھے

کئے تھے۔ خلیفہ صاحب کے مہربان پاکستان اور ہندوستان کے بہترین رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ جو ان موقر جرائد اور ریڈیو پاکستان، لاہور کی مہربانی سے مجموعوں میں شامل کیے گئے ہیں۔ مقالات حکیم کی دوسری جلدیں بھی عنقریب شائع ہو جائیں گی۔ امید ہے کہ مرحوم خلیفہ صاحب کے متعلق کتابوں کا یہ سلسلہ علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

(ش۔ ح۔ ر)

فہرست

مضمون

صفحہ

۱۱	اسلام کی اساس
۷۱	ایمان کیا ہے ؟
۸۸	نبی کریمؐ کی تعلیم کے بنیاد کی عناصر
۹۷	وحدت انسانی اور عقیدہ توحید
۱۰۴	قرآن کریم میں حکمت کا مفہوم
۱۲۴	اسلام اور آزادی فکر
۱۳۲	اسلام میں مادی ترقی کا مفہوم
۱۴۰	اسلام کا سیاسی و معاشی تصور
۱۵۸	اسلام اور جمہوریت
۱۶۷	انسان کا مل
۱۷۶	اسلامی تہذیب کا تصور
۱۸۶	تعدد انزواج
۲۰۶	اسلام اور ضبط و ملاوت

”اسلام کی نشاۃ ثانیہ نہ مغرب کی کورانہ تقلید سے ہو سکتی ہے اور نہ ان
 قسود و اصولوں اور طریقوں سے چٹے رہنے سے جو بدلتے ہوئے حالات
 کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کے اساسی
 اصولوں پر غور کریں اور ان پر عمل پیرا ہوں، اور اس احساس کمتری کو ختم
 کر دیں جس میں وہ مبتلا ہو گئے ہیں اور جو مغرب کی پیش کردہ ہر چیز کو
 اسلام کے مطابق ثابت کرنے پر انھیں مجبور کرتی ہے۔ مسلمان قوموں
 بلکہ مغرب کو بھی اسلام سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اسلام میں حریت،
 اخوت اور مساوات کے تصورات نہایت ترقی پذیر اور حقیقی ہیں،
 اور ضرورت ہے کہ ان کو ٹھیک طرح سمجھا اور ان پر عمل کیا جائے مغرب
 کا معاشرتی اور سیاسی نظام ورہم برہم ہو رہا ہے۔ کیا ہم اپنے
 نظام حیات کی نئی عمارت ان شکستہ عمارتوں کے طے سے تعمیر کرنا
 چاہتے ہیں جو ناکارہ ہو جائے گی وجہ سے منہدم کی جا رہی ہیں حقیقت
 یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دنیا کی ہدایت اور نشاۃ ثانیہ کی صرف یہی
 ایک صورت ہے کہ ہم اسلام کے پیش کیے ہوئے زندگی کے عالمگیر
 اصولوں کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔“

خلیفہ عبدالحکیم

اسلام کی اساس

ہر نظریہ حیات ایک بنیادی عقیدے پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ اصل یا جڑ ہوتا ہے، اس جڑ میں سے جو درخت اگتا ہے، اس میں بے شمار شاخیں نکلتی ہیں اور ہر شاخ میں سے کثیر تعداد میں پتے نکلتے ہیں۔ یہ اصل ثابت اور قائم ہوتی ہے۔ شاخیں اور پتے کو کھتے اور جھڑتے ہیں، ان پر خزاں اور بہار کا عمل ہوتا ہے۔ فروع میں تجدد اور تغیر و رخت کی حیات کے بقا اور ارتقا کا باعث ہوتا ہے روحانی زندگی کو بھی قرآن کریم نے ایک درخت ہی سے تشبیہ دی ہے جس کی اصل ثابت رہتی ہے اور اس کی فروع زمین سے لے کر آسمان تک پھیلی ہیں۔

عقیدہ توحید

سوال یہ ہے کہ وہ کلمہ طیبہ کیا ہے، جو اسی طرح کا ثبات و دوام رکھتا ہے۔ یہی کلمہ اصل دین اور اصل اسلام ہو گا۔ یہی وہ حقیقت حیات ہو گا جس سے تمام ہستی کی توحید ہو سکے اور جو وجود حقیقی اور ارتقائے حیات کا ضامن بن سکے۔ یہ کلمہ ایسا ہونا چاہیے جس کا عقیدہ عقل اور فطرت اور مشاہدے کی شہادت سے استوار ہو، جو کسی فرد کا تصور یا وہم نہ ہو جس پر یقین کر سنے کے لیے کو رائے اعتماد کا تقاضا نہ کیا جائے جو فطرت کی گرائیوں میں سے ابھرے اور فطرت کے مناظر و حوادث ہر قدم پر اس کی توثیق کرتے رہیں۔ فطرت کے تمام تقاضے اس سے بطریق احسن پورے ہو سکیں۔ یہ عقیدہ ہر قسم کی حکمت کی اساس ہو، تمام مسائل حیات کی گتھیاں اس سے سلجھ سکیں۔ حکمت نظری اور حکمت عملی یا ظلم اور اخلاق کے اصول اس سے منضبط ہو سکیں۔ زندگی کی لامتناہی کثرت اس ایک کلمے کی وحدت میں پروئی جاسکے۔ وہ کلمہ زندگی کے اوراق پر لیشاں کا شیرازہ بند ہو۔ اس سے اندر جو حقیقت مضمحل ہو وہ حیات جسمانی، حیات مادی، حیات اخلاقی اور حیات روحانی سب پر حاوی اور سب میں جاری و ساری ہو۔ از روئے اسلام یہ عقیدہ یا کلمہ طیبہ توحید ہے۔ قرآن نے اسی کو اصل دین

قرار دیا ہے۔ دین کے باقی تمام ارکان، تمام شریعت، تمام شعائر، تمام عبادات، تمام اصول معاش اور عقائد معاد اس ایک عقیدے کی شاخیں اور پتے ہیں۔

شرائع میں اختلاف اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ عبادت کے طریقے کم و بیش مختلف ہو سکتے ہیں، اخلاقی اصول کے ہنگامی اطلاق میں اضافی تغیر ہو سکتا ہے، سیاست کے انداز حالات کے تغیر کے ساتھ بدل سکتے ہیں، لیکن اس کلمہ طیبہ اور اس اصل ثابت میں کوئی بنیادی تغیر نہیں ہو سکتا۔ تمام قرآن مشرک کے خلاف ایک مسلسل جہاد اور توحید کے دلائل کی تکرار ہے۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اگر یہ عقیدہ کسی کے دل میں ابھی طرح گھر کر جائے تو وہ حقیقت حیات سے آشنا ہو جاتا ہے باقی تمام ثانوی حقائق ایک منطقی لزوم کے ساتھ اس میں سے خود بخود سرزد ہوں گے۔ قرآن کریم کی تعلیم کے علاوہ اس کی تائید میں بعض صحیح احادیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ رسول کریم اسی عقیدے کو بنیاد دین اور عین دین سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں دو احادیث خاص طور پر روشنی ڈالتی ہیں، ایک کے راوی حضرت ابو ہریرہؓ ہیں کہ رسول کریمؐ نے ان کو اپنی تعلیم مبارک دین اور فرمایا کہ جاؤ اس کا اعلان کرو کہ جس نے لا الہ الا اللہ کہا اس کی نجات ہو گئی۔ دوسری حدیث یہ ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت ابو ذرؓ سے کہا کہ من قال لا الہ الا اللہ فدخل الجنة جس نے توحید کا اقرار کیا کہ خدا کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔ ابو ہریرہؓ کے سپرد کردہ پیغام کے عوام تک پہنچانے میں حضرت عمر فاروقؓ ٹھاکر ہوئے، اور دوسری حدیث میں ہے کہ حضرت ابو ذرؓ غفاریؓ کو اس تعلیم نے جھنجھوڑ دیا۔ واقعہ یہ نہیں تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ نفوذ باللہ اس کو درست نہ سمجھتے تھے۔ ان کو فقط یہ خطرہ ہوا کہ عوام میں سے بہت سے لوگ یہ سمجھ بیٹھیں گے کہ لا الہ الا اللہ کہا اور چھٹی ہو گئی۔ محض اقرار باللسان کو کافی اور کتنی سمجھ لیں گے، اور اسلام جو نزل ام اخلاقی اور ضابطہ شریعت قائم کرنا چاہتا ہے، اس کو اختیار کی یا غیر ضروری سمجھ کر اس کی طرف سے غافل ہو جائیں گے۔

اگر توحید اقرار باللسان سے تصدیق بالقلب تک جا پہنچے تو اس شخص کی نظر میں اور

اس کے نتیجہ کے طور پر اس کے عمل میں بھی ضرور ایک حیرت انگیز انقلاب ہو گا، اور پوری اسلامی زندگی خود بخود اس میں سے شاخوں اور پتوں کی طرح پھوٹ پڑے گی، یہ بات سب سے زبانی اقرار سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ حضرت عمر فاروقؓ کو بجا طور پر یہ منظرہ محسوس ہوا کہ سست عمل لوگ اس سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور ممکن ہے کہ بعض بد عمل لوگ بھی یہ سمجھ کر مطمئن ہو جائیں، کہ توحید کا اقرار ہمارے تمام گناہوں کا کفار ہو جائے گا۔ اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ کی مصلحت یہی ہوئی کہ رسول کریمؐ مدثر حق نہیں ہوئے۔ حضرت ابوذرؓ کو یہ اعلان سن کر ایک دوسری طرح کا دھوکا محسوس ہوا۔ وہ بجا طور پر اخلاقی عمل کو عقیدہ توحید سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے براہ راست رسول کریمؐ سے دو کبیرہ گناہوں کا ذکر کیا اور پوچھا کہ توحید کا اقرار کرنے والا، اگر چوری کرے یا زنا کا مرتکب ہو، تو کیا پھر بھی اس کی نجات ہو جائے گی۔ اس پر رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ہاں پھر بھی ہوگی۔ یہ جواب سن کر حضرت ابوذرؓ اور زیادہ پریشان ہوئے۔ دوبارہ پوچھا، پھر جواب ملا کہ ہاں، تیسری دفعہ پھر اپنے شک کو اضطراب کے ساتھ دہرایا جس پر رسول اکرمؐ نے کسی قدر ناراض ہو کر فرمایا کہ ہاں حقیقت یہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں علی رغم انہی اہی ذر۔

جس طرح حضرت ابوذرؓ اس سے پریشان ہوئے اسی طرح اکثر مومن آج تک اس سے مضطرب ہوتے ہیں، ہمارے نزدیک اس کی سادہ توجیہ یہی ہے کہ از روئے تقاضائے بشریت کسی وقت ایک موجد سے بھی مسمولی کوتاہیوں سے بڑھ کر بڑے گناہ بھی سرزد ہو سکتے ہیں۔ تمام موجدوں اور مومنوں کا ایمان اپنی قوت اور بصیرت کے لحاظ سے ایک درجے کا نہیں ہوتا۔ انبیاء اور اولیاء سے بھونٹی بھونٹی کوتاہیاں اور غلطیاں سرزد ہوتی ہیں، کیونکہ خلائق انسان بشریت کا تقاضا ہیں، لیکن ان کی روحانی بلندی اور استقامت کی وجہ سے کبار اثم کا سرزد ہونا، ان کی فطرت کے لیے ایک امر محال ہو جاتا ہے۔ تمام موجدوں کا درجہ اس سے بہت پست ہوتا ہے اس حدیث میں یہ نہیں ہے کہ عادی سارق اور عادی زانی نجات یافتہ ہو سکتے ہیں اس کا مطلب

حرف یہ ہے کہ کبھی کبھار ایک مومن موجد سے بھی اس قسم کی لغزش سرزد ہو سکتی ہے۔ اگر وہ واقعی مومن ہے تو وہ پشیمان اور تائب ہو گا، خدا کے ہاں سچی توبہ کی قبولیت کا وعدہ ہے۔ اس کی عارضی لغزش سے اس شخص کی سیرت مستقل طور پر خراب اور تار یک نہیں ہو گی جس کی سیرت میں توحید سرایت کر چکی ہے، وہ خدا کی رحمت سے بہرہ اندوز ہے۔ توحید سے انسان کی طبیعت میں ایک فطری راستی پیدا ہو جاتی ہے۔ سیدھی نرم لکڑی کو خارجی دباؤ سے عارضی طور پر تھوڑا بہت جھکا سکتے ہیں لیکن جب وہ دباؤ ہٹ جائے تو وہ خود بخود اپنی راستی پر واپس آجاتی ہے۔ غفران اور رحمت اچھی سیرت ہی پر عمل کر سکتے ہیں۔

مذکورہ صدر احادیث کو بیان کرنے سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ اسلام عقیدہ توحید کو اصل دین قرار دیتا ہے اور اس عقیدے کی اہمیت کو تمام دیگر اعمال کے مقابلے پر زیادہ اسی تصور کرتا ہے۔ تمام رسالت اسی عقیدے کی ترویج اور تقویت کا ذریعہ ہے۔

توحید اور حکمت

قرآن کریم اپنے آپ کو حکمت کی کتاب قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ حکمت سب سے بڑی نعمت ہے۔ سن یوقی الحکمۃ فقد اوقی خیرا کثیرا۔ نبی کو بھی یہ حکم دیتا ہے کہ انسانوں کا تزکیہ نفس کے، ان کو یہ کتاب پڑھ کر سنا اور سمجھا اور اس تعلیم میں جو حکمت ہے، اس کو ان پر آشکار کر جا اب غور طلب بات یہ ہے کہ حکمت کیا چیز ہے اور توحید کے عقیدے کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔ بعض اور الفاظ بھی ہیں، جو لفظ حکمت کے قریب قریب مرادف شمار ہوتے ہیں۔ علم، معرفت یا عقل اور اہل مغرب کے ہاں سائنس کی اصطلاح۔ مغربی حکیمانہ انداز فکر کو سائنٹیفک کہتے ہیں۔ علم و عقل کہیں یا حکمت اور سائنس، دیکھنا یہ ہے کہ یہ کس انداز فکر کا نام ہے۔ کیا یہ کوئی نظری میلان یا جہتی پیاس ہے۔ اس کی اہمیت کیا ہے، اس کا مقصد کیا ہے، اس کے اندر کیا بات ہے جس کی وجہ سے وہ اس کو خیر کثیر کہتا ہے۔ قرآن کریم طرح طرح سے اس کی تائید کرتا ہے کہ تدبر و تفکر اور تعقل سے کام لو۔ عقل سے کام نہ لینے والوں کو، جانوروں

پست و رتبہ دیتا ہے۔ ان کو گونگے، بہرے اور اندھے کہتا ہے۔ مشاہدہ کائنات پر بڑا زور دیتا ہے۔ اسلام اس کا قائل ہے کہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اس میں تمام حوادث آئین کے زیر نگین، عدت اور معلول کی کڑیاں ہیں۔ کوئی واقعہ عبث یا باطل نہیں ہوتا۔ جس کو محض اتفاق کہتے ہیں اس کا وجود کہیں کائنات میں نہیں۔ مشیت الہی اور حکمت الہی ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ اسلام سے قبل تمام مذاہب نے خوارقِ عادت یا معجزات و کرامات کو خدا کی خدائی اور رسولوں کی رسالت کی حقانیت کا واحد ثبوت سمجھ لیا تھا اور یہ عقیدہ قائم کر لیا تھا کہ دین اور حکمت دو الگ الگ بلکہ متضاد چیزیں ہیں۔ دین کا تعلق مشاہدہ سے اور عقل سے نہیں بلکہ بعض اُن دیکھی باتوں کو محض اختیار پر مان لینا ہے۔

یہ تعلیم ادیان میں سب سے پہلے اسلام نے دی کہ فطرت کا مدار سنت اللہ پر ہے اور سنت اللہ میں کوئی تبدل و تغیر نہیں ہوتا۔ فطرت کے ثابت و قائم قوانین ہی سنت اللہ ہیں لیکن فطرت اللہ اتنی ہی نہیں ہے جو اس کو محسوس ہوتی ہے یا عقل جزوی یا عقل منطقی کی گرفت میں آتی ہے۔ اگر فطرت اللہ لا محدود ہے تو ہر وہ ہزار عالموں میں بھی کوئی بات ایسی نہیں ہو سکتی جس کو فوق الفطرت کہیں ہماری محدود فطرت اور محدود نظر کے لیے تو حاضر کم ہے اور غائب زیادہ۔ حاضر محدود ہے اور غائب لا محدود۔ لیکن خدا نے بھیر و علیم کے مال تو سب کچھ حضور ہی حضور ہے۔ ظلمت کہیں نہیں نور ہی نور ہے۔ جو غیب ہمارے لیے غیب ہے وہ خدا کے لیے ازلی اور ابدی طور پر حاضر ہے۔ تمام فطرت لا تنہا ہی ایک خدا کے واحد کی شان کا مظہر ہے۔ فطرت میں ہر چیز کا ہر دوسری چیز کے ساتھ براہِ راست یا بالواسطہ ربط ہے۔

انسان کی عدم معرفت اور تنگ نظری نے جب فطرت کا مشاہدہ کیا، تو اس کو حوادث کی کثرت نظر آئی۔ انسان حوادث میں اس کو کوئی باہمی ربط نظر نہ آیا۔ وہ آگ کو ایک الگ حقیقت سمجھا اور پانی کو الگ۔ ہر واقعہ کو کسی ایک قادر مگر متکون ہستی

کے ساتھ منسوب کر دیا۔ تینتیس کروڑ عناصر و مظاہر و حوادث کے تینتیس کروڑ ویوتا بنا ڈالے اور یہ ویوتا بھی کوئی منظم جماعت نہ تھے۔ ویوتا ایک دوسرے سے حسد اور نفقہ رکھنے والے، ایک دوسرے سے متضاد و اور ہر سر پر کار اور ان سب کے مقابلے میں انسان حقیر اور بے اختیار۔ اشرف المخلوقات اسی شرک کی وجہ سے جن تقویم کے مرتبے سے اسفل المسافین کے قدر ذلت میں جاگرا۔ جس کو خلیفۃ اللہ علی الارض بننے کے لیے خلق کیا گیا تھا، اور جسے شمس و قمر اور شجر و حجر کی تسخیر کا کام سپرد کیا گیا تھا وہ خود ہی بے طرح مسخر ہو گیا، جسے حکمت و رحمت کی بنا پر خوف و حزن سے بالاتر ہونا تھا وہ ہر چیز کے سامنے سے کانپنے لگا، موبہوم ویوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے اپنی قربانی کرنے لگا۔ جو جانوروں کا گوشت کھانے سے راضی نہ ہوتے تھے، ان کو اپنے چھینے بیڑوں کا گوشت کھلانے لگا۔ جہالت سے شرک پیدا ہوا اور شرک سے مزید جہالت اور جہالت و شرک نے مل کر اس کو ظالم بھی بنا دیا اور مظلوم بھی۔ اپنے اوپر ظلم کرنا دوسروں پر ظلم کرنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ شرک سے اس نے اپنے اوپر ظلم عظیم کیا اور اس ظلم نے اس کو کمال و ربجے کا ظالم بنا دیا خلیفۃ فی الارض بننے کی صلاحیت والا انسان ظلم و ستم بھولا ہو کر خدا لان و خسران میں دست افشوس ملتا رہ گیا۔

انسان میں حکمت و ہال سے شروع ہوئی، جہاں اس نے حوادث کی کثرت کو قوانین کی وحدت میں منسلک کرنا شروع کیا۔ عقل کا کام یہی ہے کہ وہ عدت کو معلول کے ساتھ وابستہ کرے، اور حوادث کے باہمی روابط کا پتہ چلائے۔ عقل کا وظیفہ یہ ہے کہ وہ ہر جزو کو کسی کل کے ساتھ وابستہ کرے، جزئیات سے کلیات تک پہنچے اور پھر کلیات سے جزئیات کو اخذ کرے۔ عقل کا یہ کام یا حکمت کا یہ سفر تب تک ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ تمام جزئیات کلیات میں منسلک نہ ہو جائیں اور تمام کلیات ایک کل میں جا کر ختم نہ ہوں، جو کل جزئیات سے پہلے بھی ہے، جزئیات کے اندر بھی ہے اور جزئیات کے بعد بھی۔

حکمت کلی یا معرفت تمام اس کا نام ہے کہ جو کل اول میں مصدر وجود قرار دیا جائے۔ وہی منتہائے وجود بھی ہو۔ ہر ظاہر باطن کا اظہار ہو، اور ہر باطن ظاہر کا سرچشمہ وجود۔ توحید کا دین بھی یہی ہے، اور سائنس اور حکمت بھی اسی کا نام ہے۔ عالم طبعی کی کوتاہ نظری اور خامی اتنی ہی ہے کہ وہ قوانین یا وحدتوں کی تلاش میں اپنے دائرہ تحقیق کو مادی اور محسوس حوادث تک محدود کر لیتا ہے۔ ظاہر و باطن کے لحاظ سے کچھ کلیات آفاق سے حاصل ہوتے ہیں اور کچھ کلیات انفس سے۔ قرآن حکیم کی تعلیم یہ ہے کہ انفس و آفاق دونوں کے کلیات از روئے مشاہدہ و عقل دریافت کرتے ہوئے ان سے آگے گزر کر ایسے کل کی طرف بڑھو جو انفس و آفاق یا ظاہر و باطن دونوں کی جزئیات اور کلیات کا ماخذ و دونوں پر حاوی اور دونوں میں جاری و ساری ہے۔ قرآن حکیم فطرت کے مشاہدے پر بہت زور دیتا ہے، اور اس کو خدا شناسی کا راستہ کہتا ہے۔ لیکن فطرت خارجی بھی ہے اور باطنی بھی، وہ مادی اور جہانی بھی ہے اور نفسی بھی۔ اس لیے یہ ارشاد ہے کہ فی انفسکم افلا تبصرون جس سے یہ تعلیم اخذ کی گئی ہے کہ من عرف نفسه فقد عرف ربه جس کو اپنے نفس کا عرفان حاصل ہوتا ہے، اس کو خدا کا بھی عرفان حاصل ہوتا ہے۔ توحید محض اس عقیدے کا نام نہیں ہے کہ خدا یا معبود ایک ہے اور متعدد نہیں۔ قرآن حکیم نے توحید کے اس بنیادی عقیدے کی ضروری تشریح بھی کی ہے اور اس ذات واحد کے صفات بتائے ہیں۔

صفات الہیہ

خدا کی سب سے اہم اور اساسی صفت رحمت ہے۔ رحمت کے مفہوم میں رحم بھی ہے اور محبت بھی، اور فیض بھی بقرآن کریم بسم اللہ الرحمن الرحیم سے شروع ہوتا ہے اور سورہ فاتحہ کا اقتراح بھی رحمت سے ہوتا ہے۔ انسان کے لیے ہر وہ جو یا مادی ہے یا ذہنی، یا زمان میں ہے یا مکان میں، یا زمان و مکان دونوں میں، اس کے علاوہ وجود کا کوئی تصور ممکن نہیں۔ لہذا خدا کی نسبت اگر ہو الوجود کہیں یا لا الوجود الا اللہ کہیں تو یہ موجودیت کا تصور ایمانی یا وجدانی ہی ہو سکتا ہے اور اکی نہیں ہو سکتا۔ صفات الہیہ کی بابت بھی یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کی ماہیت کیا ہے، خدا عظیم ہے لیکن سستی مطلق میں

علم کی کیا کیفیت ہو سکتی ہے، اس کا تصور ممکن نہیں۔ انسان کا ہر علم جزوی ہوتا ہے۔ اس کے کیات بھی دراصل جزئیات ہی ہیں۔ اور اس کے زمان و مکان عالم کل ہستی کا علم کس انداز کا ہو گا یہ اور اک کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ لیکن خدا کے صفات کو انسان آثار و امثال سے کسی قدر پہچان سکتا ہے جیسا کہ عارفِ رومی کہہ گئے ہیں۔

پس ماہیات اوصاف کمال کس انداز جز با آثار و امثال

اسلام کا اصل اور بنیادی کام خدا کی نسبت انسانوں کے عقائد کو درست کرنا تھا۔ اسلام نے توحید ہی کو اصل دین قرار دیا ہے۔ اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ یہ اصل اگر درست ہے تو نتیجے کے طور پر تمام علم اور تمام عمل درست ہو سکتا ہے لیکن اگر یہی اصل بگاڑ جائے اور فاسد عقیدوں سے شرک جلی یا شرک خفی پیدا ہو جائے تو زندگی کے تمام فروخ اس اصل کے بگاڑ سے بگاڑ جائیں گے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ نبیوں کا کام خدا کی توحید کی توضیح و تحقیق ہے۔ رسالت ہمیشہ سے اسی حصول مقصد کا ایک ذریعہ رہی ہے۔ اسلام میں ختم نبوت کے عقیدے کی بنا بھی یہی ہے کہ آخری مرتبہ اس عقیدے کو خالص کر کے محفوظ کر دیا گیا۔ اس طرح سے رسالت کی جو غرض تھی وہ پوری ہو گئی اور نوع انسان پر اس محبت کا اتمام ہو گیا۔ ماسنہ نہ ماسنہ کا اختیار ہے۔ لیکن بات صاف کر دی گئی۔ اکثر مذاہب عقیدہ توحید کے مدعی تھے لیکن کہیں بھی توحید کا تصور جہل کی آمیزش سے پاک نہ تھا۔ ایک خدا کے ساتھ لاتعداد دیوتا موجود تھے، زندگی کا اصلی کاروبار دیوتاؤں کی متلون مرضی پر موقوف تھا۔ ایک غیر مرنی خدا کے لیے کوئی حقیقی کام نہ تھا۔ جیسا میوں اور مہندوؤں میں ایک خدا کا تصور موجود تھا، لیکن یہ خدا کسی ایک انسان میں مجسم بھی ہو سکتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ ہر قوم میں اصلاح اخلاق اور صحیح عقیدہ توحید کی تحقیق کے لیے نبی بھیجے گئے، جو اعلیٰ درجے کے انسان ہی ہوتے تھے جو نہ قادر

مطلق تھے اور نہ عالم کل۔ ان کو غیب کی اتنی ہی خبر رہتی تھی جتنی کہ خدا کی طرف سے ان کو مل جائے۔ لیکن ہندوؤں اور عیسائیوں نے ان کا تہذیبی تصور کر لیا کہ دنیا کی اصلاح کے لیے خدا کسی انسان کی صورت میں اتر آتا ہے۔ یہ بھگوت گیتا میں کرشن کی زبانی

یہی عقیدہ بیان کیا گیا ہے۔ جسے فطری سننے اس شعر میں ترجمہ کیا ہے۔
 جو بنیاد و دیں سست گرد و بے برآریم خود را بشکل کے
 مشرق اور مغرب میں فلسفیانہ افکار ترقی کرتے ہوئے توحید تک پہنچ گئے تھے لیکن
 ویدانت اور جدید افلاطونیت میں خدا بالکل در ادا الوداع اور سرنگ یعنی صفات سے مطلقاً
 معزاً ہو گیا تھا۔ ان دونوں فلسفوں میں خدا نہ صاحب ارادہ ہستی رہی اور نہ انسانوں یا
 دیگر مخلوقات سے اس کا کوئی عاقلیت یا ربوبیت کا تعلق باقی رہا، یونانی فلسفہ سقراط
 افلاطون اور ارسطو تک پہنچ کر عقلی توحید کا ایک نظام فکر مرتب کر چکا تھا۔ انھوں نے عقلی
 منطقی کو عقل کل قرار دیا اور خدا محض وحدت منطقی کا مرادف بن گیا۔ افلاطون نے کہا
 کہ عالم ازلی عالم مثل یا عالم تصور است عقابہ ہے۔ تصور است ہی اعیان ثابتہ ہیں، اور یہ
 اعیان ثابتہ ایک عین ثابت سے سرزد ہو رہے ہیں۔ تمام تصورات کا ماخذ ایک تصور
 کلی ہے جس کو علم کہتے ہیں۔ وہ صرف کلیات ہی کا ہو سکتا ہے، جزئیات کا علم، علم
 نہیں کہلا سکتا۔ اس لیے کہ جزئیات کے وجود میں عدم کی آمیزش ہے۔ معدوم معلوم
 نہیں ہو سکتا، اس لیے خدا کو جزئیات کا کوئی علم نہیں۔ خدا کلیات ہی کا ایک ڈھانچہ
 ہے، اس کو افراد سے کوئی واسطہ نہیں خدا خود ہی عالم ہے اور خود ہی معلوم ہے۔ خدا
 کو اپنے سوا اور کسی چیز کا علم نہیں، اس لیے کہ خدا کے باہر ماسوا کا وجود ہی حقیقی نہیں۔
 اس قسم کا خدا فلسفیوں کے کسی کام آجائے تو آجائے باقی انسان اس سے کسی قسم کا
 رابطہ قائم نہیں کر سکتے۔ نہ ایسے خدا سے زندگی کا کوئی مسئلہ حل ہوتا ہے۔ اور نہ
 انسانی نفس کو اس سے کسی قسم کی تسکین حاصل ہو سکتی ہے۔ فلاطینوس کے فلسفہ اشراق
 میں خدا ایک مہدر نور بن گیا، جس سے کائنات بطریق تنزل سرزد ہوتی ہے، جو کچھ اس
 سے سرزد ہوتا ہے وہ بلا ارادہ سرزد ہوتا ہے۔ اور وہ سرگز اس کی طرف نہیں دیکھتا
 یہ خدا ایسا نہیں ہے کہ اس کو بکار و تدوہ سننے یا اس سے کوئی عبادت یا محبت کا رشتہ
 قائم ہو سکے۔ کچھ ایسا ہی حال ویدانت کا بھی ہے، جس نے دیوتاؤں سمیت تمام کائنات
 کو بایا وجود پر بھی قرار دیا۔ ویدانت کی یہ ورا دالودا ہستی بھی نہ خالق ہے، نہ

عالم اندر حیاں، نہ رب۔ شکر اچار یہ سکے نزدیک یہ ذات بزرگن یا صفات سے معر ہے۔
 ہر وجود اور ہر انفرادی نفس دھوکے کی پیداوار ہے، زندگی کا مقصد اس کو باطل سمجھ کر
 اس سے گریز کرنا ہے۔ نفوس و موجودات کے بطلان کی معرفت اصل گیان ہے جس
 کے حصول کے بعد نہ نفس باقی رہے گا اور نہ کائنات۔ اس نفس کی سے ذات مطلق
 کائنات ہو جائے گا۔ فلسفوں کے علاوہ ادیان کا یہ حال تھا کہ بدھ مت میں خدا بالکل
 غائب ہو گیا، کائنات اور نفوس بے حقیقت ہو گئے۔ ہر قسم کی آرزو ایک دھوکا ہے۔
 آرزوؤں کے دھوکے حیات آفرینی کہتے ہیں۔ اور یہ آرزوئیں عارضی طور پر مستم
 ہو جاتی ہیں۔ انسان کے لیے فقط ایک ہی آرزو حقیقی ہو سکتی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ
 اس کی کوئی آرزو نہ رہے۔ آرزوؤں کے ناپید ہونے سے زندگی میں آواگون کا چکر
 ختم ہو جائے گا اور وہ حالت پیدا ہو جائے گی جسے نروان کہتے ہیں۔ جس کے متعلق
 کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ نفی مطلق کے بعد جو اثبات مطلق حاصل ہوتا ہے تصور کے لیے
 وہ خود بھی ایک سلبی کیفیت ہے جس کے متعلق کوئی ایجابی تصور قائم نہیں ہو سکتا۔ زندگی کا
 نصب العین زندگی کو الم آفریں دھوکہ بھرا ہے۔ اس سے گریز کرنا ہے۔ گویا احسن لائحہ عمل
 یہ ہے کہ زندگی سے ذہنی اور عملی گریز کے طریقے یکے جائیں۔ ترک دنیا، ترک حقیقی،
 ترک مولا، ترک ترک۔ بدھ مت کا نظریہ حیات اس مصرعہ سے بہتر چند الفاظ میں
 بیان نہیں ہو سکتا۔ باطل سے پھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش میں حتیٰ سے بھی نجات
 حاصل ہو گئی ہے۔

نہ کفر، نہ اسلام، نہ دنیا و نہ دین

نہ دے دیدم نشہ بروئے زمیں

دہر و دہاں کو ابو ذہرہ ایس

نہ سنی نہ حقیقت، نہ شریعت، نہ یقین

کائنات بھی معدوم، دیوتا بھی معقود، آرزوؤں کا صفایا، نصب العین حیات اور

ہر چیز سے بے تعلقی، ہر شے سے نجات، نہ کوئی مقصود، نہ محبوب، نہ تلاش، نہ ہجو۔

زہبانیت ترقی کرتے ہوئے کامل نفی حیات تک پہنچ گئی ہے۔

نفسانیوں نے مسیح علیہ السلام کی تعلیم کو عجیب طریقے سے مسخ کیا۔ وہ مسیح جو

اپنے لیے نیک کا لفظ بھی استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا (جب اس کو کسی نے اچھا کہا تو اس نے جواب دیا کہ اچھا تو میرا آسمانی باپ ہے) اس پر گزیدہ بندہ خدا کو غلط اندیش پرستاروں سے خدا کا شریک بلکہ عین خدا بنا دیا۔ توحید کی تعلیم دینے والا، تثلیث کا شکار ہو گیا، اور اقا نیم ملاشہ میں سے ایک اقنوم بن گیا۔ پہلے اس کو خدا کا بیٹا بنا یا پھر بیٹے اور باپ کو ہم ذات بنایا، پھر اس خدا کو تمام جہان کا کفارہ بننے کے لیے مصلوب ہو کر بہشت پر مٹی موت مرنا پڑا۔ خدا نے رحیم اپنی رحمت اور ربوبیت کا اظہار اس سے بہتر طریقہ سے نہ کر سکا۔ دیوتاؤں کو انسانی قربانی سے خوش کرنے کا عقیدہ ہزار ہا برس سے تو ہم پرست انسانوں میں راسخ ہو چکا تھا۔ عیسائیت میں توحید اسی دور دشت کی طرف عود کر گئی۔ مسیح رحمت بن کر آیا تھا لیکن اس کے پیروؤں نے اس کو ایک غیر عادل، اور ظالم خدا کا نمائندہ بنا دیا۔ خدا کے رحیم ہونے کا دعویٰ اس کے اعمال سے باطل کر دیا گیا۔ آدم کا گناہ موروثی ہو گیا۔ جو انسان پیدا ہو گا، وہ ناکروہ گناہ کا مجرم پیدا ہو گا۔ خدا کو بدنام کرنے کے بعد عیسائیت نے انسان کو ذلیل کیا، یہ جوڑم کسی نیکی سے نہیں دھل سکتا۔ حسن عمل نجات کے لیے کارگر نہ تھے۔ خدا نے ایک طرف معصوم مسیح کو بھینٹ چڑھایا اور دوسری طرف یہ حکم دے دیا کہ کسی کے نیک اعمال کام نہیں آسکتے، جب تک کہ کوئی شخص اس پر ایمان نہ لائے کہ مسیح کی صلیبی موت اس کے گناہوں کا کفارہ ہو گئی ہے۔ یہ ایمان پیدا کر لینے کے بعد بے عمل کو بھی نجات حاصل ہو جاتی ہے۔

ادیان اور فلسفوں کے اس مختصر بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ توحید کے عقیدے کے بغیر یا توحید کے عقیدے کو مسخ کرنے سے کس طرح زندگی کے متعلق تمام تصورات مسخ ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اسلام نے توحید کو اصل دین قرار دیا ہے۔ اگر یہ عقیدہ درست ہو جائے تو عبادت بھی درست ہو جاتے ہیں اور معاملات بھی جس کار رابطہ خدا کے ساتھ درست ہو جاتا ہے، اس کے نظریات اور اخلاقیات خود بخود بطور نتیجہ سراپا مستقیم پر آ جاتے ہیں۔ اسلام نے توحید کو اس قدر خالص کر دیا کہ اس سے

زیادہ خالص کرنا ممکن نہیں۔

توحید ہی سے سرزد ہونے والا اسلام کا بنیادی عقیدہ جس سے باقی تمام عقائد اور اعمال صالحہ بطور نتیجہ حاصل ہوتے ہیں، یہی ہے کہ یہ کائنات مہمل اور بے مقصود نہیں ہے۔ یہ کائنات مایا نہیں، باطل نہیں، تماشا نہیں۔ خدا کی قوتوں اور نعمتوں کے خزانے لا محدود ہیں، لیکن وہ ہر شے کو ایک معین انداز سے خلق کرتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز میں ایک صنعت ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا ایک صانع ہے۔ اسی میں حسن و جمال ہے جو اس پر دلالت کرتا ہے کہ اصل ہستی خلاق و جمیل اور جمال پسند ہے۔ اس میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی آئین کے ماتحت ہوتا ہے، کوئی واقعہ اتفاقی یا بے علت، ظہور پذیر نہیں ہوتا۔ اسلامی عقیدے کے مطابق کوئی ہستی بے جان نہیں، زمین و آسمان میں جو کچھ ہے وہ زبان حال سے صانع کا تسبیح خواں ہے خواہ ہم اس تسبیح کو نہ سمجھ سکیں۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند بامن و تو مردہ با حق زندہ اند
لطیفات وجود میں ہر طبقہ اپنا مخصوص آئین اور مخصوص نظام رکھتا ہے۔ آئین و نظم عقل کے مظاہر ہیں، اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ مادی اجسام میں بھی ایک قسم کی عقل ہے، جسے ہم اپنے مقابلے میں لاشعوری عقل کہہ سکتے ہیں۔ اجرام فلکیہ اپنے مداروں میں نہایت حساب سے گردش کرتے ہیں کل فی فلات یسجون کسی کی مجال نہیں کہ وہ بے حساب آگے پیچھے ہو جائے۔

اسلام سے قبل عقلیت اور روحانیت دونوں غلط راستوں پر پڑ گئی تھیں۔ عقولات اپنی تجرید میں موجودات سے بے تعلق ہو گئے تھے، اور افلاطون کی طرح یہ نظریہ قائم کر دیا گیا تھا کہ معقولات لطیف ہیں اور موجودات کثیف لہذا کثیف کو چھوڑ کر لطیف کی طرف صعد کرنا چاہیے۔ اسی نظریہ کے ماتحت جسم کو روح کا زنداں قرار دیا گیا۔ جسم کو گھلاتا روح کی پرورش کرنے کے لیے لازمی ہو گیا۔ عقلیت اور روحانیت دونوں کا رخ رہبانیت کی طرف ہو گیا۔ ادیان اور فلسفوں نے زندگی کے خلاف

بغاوت کر دی۔ مادہ اور مادّی کائنات، جسم اور جسمانی زندگی، سب مردود اور ملعون ہو گئے۔ خالق کا مخلوق سے رشتہ منقطع ہو گیا، حکمت اور روحانیت ہی رہ گئی کہ قرار اور گریز کی راہیں تلاش کی جائیں۔ بدصورت اور عیسائیت دونوں نے دنیاوی زندگی کو ملعون قرار دیا۔ نسل انسانی کی بقا اور افزائش گنہگاری کا فعل بن گیا۔ روحانی شخص اس کو کہنے لگے جو کوئی کام کاج نہ کرے۔ بھکشتو بلند درجے کا انسان بن گیا، سادھو انسان کامل ہو گیا، راہب کے لیے شادی کرنا ناجائز ہو گیا۔ ایک مرتبہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو راہب سے ملاقات ہوئی، جو بیوی بچوں کو چھوڑ کر ہمالہ کے پہاڑ میں چلا گیا تھا۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ کالج میں فلسفہ پڑھتا تھا۔ میں نے یہ ارادہ کیا کہ تھوڑی سی بحث کر سکے اس کی رہبانیت کو ایک لغو فعل ثابت کر دوں۔ چنانچہ میں نے اس سے کہا کہ حضرت جو طریقہ آپ نے اختیار کیا ہے اگر سب ہی اختیار کریں تو دنیا ہی ختم ہو جائے۔ اس نے جواب دیا کہ ہم تو یہی چاہتے ہیں، اس سے بہتر اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ یہ دنیا جو سراسر دھوکا ہے ناپید ہو جائے۔

لیکن مذہب واسطے بعض اوقات پوچھتے ہیں کہ اسلام دنیا میں کیا نیا تصور لایا۔ اس کا جواب سادہ اور سہل ہے۔ اسلام نے کائنات کو حق اور زندگی کو نعمت قرار دیا۔ کچھ نعمتیں خدا کی ربوبیت مہیا کرتی ہیں، اور کچھ اور نعمتوں کو سعی و عمل کا نتیجہ شمار کرتی ہیں۔ زندگی میں سوز کا دھیس نظر آتی ہیں۔ وہ انسان کو مشق ارتقا کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ زندگی کا مقصد عرفان اور سیرت سازی ہے۔ کوئی مشکل یا مصیبت شر محض نہیں۔ خدا خیر مطلق ہے۔ اس لیے وہ شر مطلق کا آفریدہ کار نہیں ہو سکتا۔ شیعیت کا اصول یہ ہے کہ خدا شر سے برا لگے کہ خیر مادیوں کا باشد۔ نظر عارف اور عمل صالح ایک اکسیر ہے جو ادنیٰ کو اعلیٰ اور شر کو خیر میں تبدیل کر سکتی ہے۔ موت اور حیات ایک سہمی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ ان میں کوئی تضاد اور تناقض نہیں۔ اگر کوئی شخص زندگی کے آئین سے آشنا ہو جائے تو وہ ہر زحمت کو رحمت میں تبدیل

کر سکتا ہے، اور موت کو زندگی میں بدل سکتا ہے۔ آئین ہستی یہی ہے کہ ہر قدم پر فتا سے بچا حاصل ہوتی ہے۔ ہر بیانی مذاہب اور فلسفوں کو زندگی سراسر زحمت دکھائی دی اور وہ پکار اٹھے کہ

یہ درہم سرا ایسا ہے کہ سر جائے تو جائے

بعض نے کہا نہیں یہ ایسی لعنت ہے کہ سر جائے اور جان جائے تو بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہ ہوا جب تک کہ اس سے چھٹکارے کا کوئی خاص نسخہ ہاتھ نہ آئے۔ اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے مر کے بھی چین نہ پایا تو کہہ کر جائیں گے کسی نے کہا کہ

قید جیٹا بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں قرآن کریم اس کی تصدیق کرتا ہے کہ اگر ایمان یا صحیح زاویہ نگاہ اور صبر کی صفت نہ ہو تو زندگی کھائے ہی کا سووا معلوم ہوگی۔ والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا وعملوا الصالحات وتواصوا بالحق وتواصوا بالصبر۔

فطرت خارجی کا بنانے اور چلانے والا خود خدا ہے۔ وہ اس میں نظم و آئین بھی پیدا کرتا ہے اور حسن و جمال بھی۔ وہ براہ راست اس کی بقا اور ارتقا کا ضامن ہے۔ لیکن انسان جس کو اس دنیا میں خدا کا نائب بنانے کے لیے بھیجا گیا ہے، اس کے متعلق ایک دوسرا آئین ہے۔ جس ہستی کو قدرت مطلقہ سے سب سے زیادہ برہ اندوز بنا کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس کو شروع میں سب سے زیادہ بے بس بنایا جاتا ہے۔ تمام حشرات الارض پیدا ہوتے ہی اپنی زندگی کے خود کفیل ہو جاتے ہیں۔ انسان کے بچے کی مدت دراز تک یہ حالت ہوتی ہے کہ اگر بروقت اس کی دیکھ بھال نہ کی جائے تو وہ زندہ نہ رہ سکے۔ انسان کو سحر کائنات اور قاور علی الفطرت بنانا مقصود ہے اس لیے اس کا وظیفہ حیات یہ ہے کہ وہ خود اپنی تقدیر کا معمار بنے اس سے کم تر مخلوق کی تقدیر کلیتہً خدا سے قادر کی ساختہ پرواختہ ہے۔ انسان کو عقل اور اختیار اور غیر معمولی صلاحیتیں عطا کر کے یہ حکم دیا گیا کہ وہ ان کے صحیح استعمال سے ہر مہم کو

کند بناتا جائے۔ اگر اس کی نگاہ نہ ہوئی اور اس کا عمل صحیح نہ ہوا تو وہ کالا ٹھکانہ بن جائے اور اس کی کسیر حیات میں جانوروں سے بھی پست تر ہو جائے گا، اور اگر ایمان اور عمل صالح کی کسیر حیات سے کام لے گا تو خدا کی نیابت میں کائنات کا حکمران اور مجبور و ملامت ہو جائے گا۔ انسان کے لیے زندگی خواہ نعمت بھی ہے اور میدانِ جہاد بھی۔ اگر اس نے جدوجہد سے گریز کیا اور زندگی کی رکاوٹوں کو دیکھ کر آنسو بہانے لگا تو کوئی نعمت بھی اس کے لیے نعمت نہ ہوگی۔ غلط روحانیت یا رہبانیت جدوجہد سے گریز کرنے سے پیدا ہوئی، لیکن مشکلات کی طرف سے آنکھیں بند کر لینے سے مشکلات رفع نہیں ہو جاتیں بلکہ اور بدتر صورت اختیار کر لیتی ہیں۔

رہبانیت حقیقت میں یاس اور قنوط کی پیداوار ہے۔ مگر خدا انسان جذبات کی کشاکش اور زندگی کی پیکار کو دیکھ کر ہر قسم کی اعلانیٰ سے مایوس ہو گیا۔ اس نے زندگی سے گریز کر کے سیدھا خدا کی طرف بڑھنا چاہا، لیکن قرآن حکیم کہتا ہے کہ وہ قریب الہی اور رحمت الہی کا حق ادا نہ کر سکا کیونکہ اس کا زاویہ نگاہ زندگی اور خدا دونوں کے متعلق غلط تھا۔ اس کا مقصد غلط نہ تھا لیکن حصول کا راستہ غلط تھا جس کو اس نے صراطِ مستقیم سمجھا وہ ایک بڑے ہیچ بھول بھلیاں تھا۔ مگر اسی سے اس کا راستہ اور طویل ہو گیا۔ بس کہ دراز اوقفہ جاوہ زکراہیم۔

یہ صحیح ہے کہ کوئی مذہب بھی جس میں قنوط ہی قنوط ہو، فطرتِ انسانی کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا اس لیے رہبانی مذاہب نے اکثر یہ کیا کہ اس دنیا اور اس زندگی سے تمام امیدیں منقطع کر کے ان کو حیاتِ بعدِ موت یا کسی کینیتِ ماورائے حیات کے ساتھ وابستہ کر دیں جس سے ایک طرح کی آخرت پرستی پیدا ہو گئی۔ اسلام موجودہ زندگی سے اعلیٰ تر زندگی کا منکر نہیں ہے بلکہ یقین اعلیٰ درجات، اوتی درجات حیات کا حق ادا کرنے کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اسلام ترکِ دنیا کا نام نہیں، بلکہ دنیا کو دین بنانے کا نام ہے۔ اسلام نے عبادت کا مفہوم بدل دیا۔ دیگر مذاہب میں عبادت ایک ٹھکانہ یا محل بن کر رہ گیا تھا، جسے پر جاپاٹ سکتے ہیں مادیوں یا خدا کے سامنے کچھ بھی نہیں یا مذہب یا مذہب بن کر رہ گیا تھا، یا ان

کو خوش کرنے کے لیے معینہ مشترک یا دعائیں پڑھنا۔ اسلام نے عبادت کے مفہوم کو وسیع کر کے تمام حیات طیبہ کا ہم معنی بنا دیا۔ دین کا مفہوم واضح اور معین کرنے کے ساتھ ہی خود بخود عبادت کا مفہوم بھی معین ہو گیا۔ اسلام میں دین اور فطرت اللہ ہم معنی ہیں۔ تمام موجودات خدا کی فطرت اور اس کی سنت کی آئینہ دار ہے۔ ازلی اور ابدی ہونے کے لحاظ سے اس کے آئین میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس فطرت میں توں نہیں ہے۔ فطرت اللہ کا سب سے بڑا منظر افسان ہے۔ فطرت اللہ الہی فطر الناس علیہا ذالک الذی بنی علیہم کسی مذہب یا فلسفے میں دین کی اس سے بہتر تعریف نہیں مل سکتی۔ کوئی کتاب ہے کہ دین ان عقائد کا نام ہے جن کا کوئی ثبوت مشاہدے یا عقل سے نہیں مل سکتا کوئی کتاب ہے کہ دین فطرت سے گریز کرنے کا نام ہے۔ اسلام کتاب ہے کہ دین عین فطرت ہے۔ اس لحاظ سے کائنات میں کوئی چیز بھی ہے۔ دین نہیں ہے۔ شجر و حجر کا بھی دین ہے۔ آدم و نوح کا بھی دین ہے۔ تمام کائنات دین پر قائم ہے۔ ستاروں کا اپنے مداروں میں حساب ہے۔ چاند ستاروں کا دین ہے۔ اور یہ حکم برواری ان کی عبادت ہے۔

گر چرخ فلک گردی سر بر خط فرمان نہ

ورگوئے زمیں باشی وقت خم چو گالی شو

دیگر مذاہب میں یہ مولکہ عبادت کا مفہوم تک کر دینے کے وجہ سے فقط خاص قسم کے اعمال کو عبادت سمجھ لیا گیا۔ خاص خاص ایام اور اوقات اور خاص خاص طریقے اس کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ کچھ لوگ ان طریقوں سے سراسر قرار دیے گئے۔ وہ پیشہ و مذہبی گروہ بن گئے۔ ان پیشہ و مشاوری کی مدد کے بغیر عام لوگ مخصوص عبادت بھی ادا کرنے کے مجاز نہ رہے۔ برہمنوں کے اور وید کوئی نہ پڑھ سکتا تھا۔ عجمی ذات والوں کے لیے مذہب میں یا دخل اندازی اور یہ اجارہ شکنی جرم عظیم بن گیا جس کے لیے بدیہی عذاب و سزائیں تجویز کی گئیں۔

عبادت ایک مخصوص تکنیک بن گئی۔ جو ہر شخص کے بس کی بات نہ رہی۔ البتہ وہ

پر رہتی کہ یہ نظر ہو کہ اگر آزادانہ طور پر دین کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لئے تو نہ رہی

پیشواؤں کا تفوق زائل ہو جائے گا۔ اسلام نے معبود کو بلا واسطہ عابد کے قریب کر دیا۔ عابد و معبود کے درمیان کوئی دیوار حائل نہ رہی۔ اسی طرح اسلام پہلا دین ہے جس نے عبادتِ مخصوصہ کے لیے بھی کسی مہد یا عبادت گاہ کو لازم قرار نہیں دیا۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ہمارے دین کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ تمام دنیا ہمارے لیے مسجد بنا دیا گئی ہے۔ دنیا کا چہرہ چہرہ کعبہ گاہ ہے، ہر قطعہ زمین جس پر کعبہ کیا جاتا ہے رہاں کا فرش عرش الہی سے ملحق ہو جاتا ہے۔ جب خدا انسان کی شہ رگ سے بھی قریب تر ہو گیا تو پیشہ و مذہبی الجھٹلوں کی ضرورت نہ رہی، جن کی مدد سے ہم خدا کا قریب حاصل کر لیں۔ اسلام میں نہ مسجد کی ضرورت رہی اور نہ پیشہ و عابد کی۔ اس کے علاوہ تمام اعمال صالحہ عبادت میں داخل ہو گئے۔ محنت سے روزگار پیدا کرنا بھی عبادت قرار دیا گیا۔ انکاسب حسب اللہ۔ دنیا کے تمام کاموں اور تمام حرفوں اور پیشوں میں روزگار پیدا ہو گیا۔ کوئی کام نہ نقصہ نہ اذی رہا، نہ اعلیٰ۔ جو کام اصولی خیر حصول خیر اور آئین فطرت کے ماتحت کیا جائے، وہ اعلیٰ کام ہے اور عبادت ہے در بڑے سے بڑا کام اگر آئین الہی کو نظر انداز کر کے اس کی خلاف ورزی اگر سے کیا جائے تو وہ مردود و فاسد ہے۔

اسلام کا بنیادی نظریہ ہی یہ تھا کہ دین اور دنیا الگ الگ چیزیں نہیں ہیں دنیا کو صحیح نظر سے دیکھنا اور اس میں حسنات کا پیا کرنا ہی دین ہے۔ دنیا اتقانی اللہ فیہا حسنة و فی الاخرة حسنة۔ اسلام نے یہ گرتا یا کہ کس طرح تمام زندگی پر عبادت کا رنگ یا صبغة اثر چڑھ سکتا ہے تمام طبیعات انسان کے لیے حلال ہو گئے، علم و حکمت کے تمام دروازے کھل گئے، کوشش کرنے والوں کو یہ خبر دی گئی کہ صلاح و فلاح میں مادی کو صحیح راستے بتائے جائیں گے۔ دین جہاد و اخینا التہجد یتعلم شیکھا۔ حکمت کے طالب کو حکمت عطا ہوگی، جو خیر کثیر ہے جس سے اس کو حقیقت کا عرفان اور حیاتِ طیبة حاصل ہوگی۔ مومن کے لیے ارتقا کے تمام راستے کھول دیے اور اس کا احسان کر دیا کہ دین انسانوں کے لیے تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ اسلام میں نہ عبادت میں تنگی ہے اور نہ صالحات میں۔ خدا انسان سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتا جو اس کی

قدرت اور رحمت سے بالاتر ہو، اسلام میں ہر حکم اور ہر ہدایت کے ساتھ تہذیب اور سہولت کے پہلو موجود ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ وہ طریقوں میں سے وہ طریقہ اختیار کرو جس میں سہولت ہو بشرطیکہ وہ گناہ نہ ہو۔ اسلام نے جس دنیا کو مومن قرار دیا وہ بے دین دنیا ہے جو خدا کی طرف سے غافل ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔

چیت دنیا از خدا غافل شدن سنے قماش و فقرہ و فرزند و زن
حقوق العباد کی ادائیگی حقوق اللہ سے کوئی الگ تھلگ چیز نہیں۔ یہ تفریق محض اضافی ہے جو شخص بندوں کا حق ادا کرتا ہے، وہ خدا کا حق ادا کرتا ہے۔

طریقت بحر خدمت خلق نیست بہ تسبیح و تحادہ و رقی نیست
صلح و جنگ

اسلام کو اس کے دشمنوں نے اور نادان دوستوں نے ہمیشہ زنی کا مذہب قرار دیا۔ یہ ایک بتانِ عظیم ہے۔ ایسے دین کے متعلق جس کی ماہیت اور جس کا مقصد ہی سلامتی سلامت روی اور امن کو شے ہے۔ اسلام کے ساتھ تاریخ ادیان میں کسی دین کے لیے کوئی معنوی اہم نہیں ہے۔ انسانوں نے ادیان کو انبیا اور مشوایان دین کے ناموں کے ساتھ منسوب کر رکھا ہے۔ کوئی دین بدعت کہلاتا ہے، کوئی عیسائیت، کوئی زرتشت کے نام کے ساتھ منسوب ہے، کوئی موسیٰ کے ساتھ۔ اسلام نے یہ اعلان کیا کہ رسولوں اور پیغمبروں کے ناموں سے دین الہی کا منسوب کرنا ناجائز ہے۔ رسولوں کی رسالت ذریعہ حصول مقصد ہے، بذاتہ مقصود نہیں۔ دین ازلی اور ابدی حقیقت ہے، اور یہ سرمدی حقیقت

امن جوئی ہے۔ انسان جب راہِ راست سے بھٹک جاتا ہے تو سب سے پہلے اس کے نفس میں غارتگی شروع ہوتی ہے۔ ایک خواہش دوسری خواہش سے ایک جہت دوسری جہت سے برسرِ پیکار ہوتی ہے۔ انسان کی اندرونی نفسی طاقت میں عدل کی جگہ ظلم اور امن کی جگہ فساد رونما ہے۔ انسان دوسروں پر ظلم کرنے سے پہلے اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور پھر ہی داخلی ظلم خارجی ظلم کی مختلف صورتیں اختیار کرتا ہے، اور انسان اپنے ماحول سے مخالفت شروع کرتا ہے، جو شخص اپنے پر ظلم کرتا ہے وہ دوسرے

کے ساتھ عدل کیسے کر سکتا ہے۔

تو بخوشی چہ کروں کہ باکمی نظری

ایسا شخص ہر جگہ ہر حالت میں پھر انسان کے ساتھ فساد کا باعث ہوتا ہے۔ اسلام کا مقصد واحد یہ ہے کہ نفس و آفاق اور داخلی و خارجی فتنہ و فساد کو روکا جائے۔ قرآن کریم نے زندگی کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈال کر دیکھا کہ انسانی زندگی میں فتنہ و فساد کس کس راستے سے داخل ہوتا ہے، اور پھر ان تمام راستوں کو مسدود کرنے کے طریقے بتائے ہیں۔ ہر قوم نے اپنے اپنے دیوتا اور معبود تراشی دیکھے تھے، ایک ہی قوم کے مختلف دیوتا بھی آپس میں ہم آہنگ نہیں تھے، منی ہر فطرت میں ہر منظر کا ایک رب النوع تھا، اور آپس میں وحدت عمل کے لیے ان میں کوئی بھرتہ نہیں تھا۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ کائنات ایک منظم حقیقت ہے۔ اس کے تمام آئین کسی مرکزی آئین سے سرزد ہوتے ہیں، قرآن کہتا ہے کہ موجودات میں اگر کئی خالق اور ناظم ہوتے تو اس میں فساد پھاڑتا۔ اگر کائنات میں کثرت حوادث کسی وحدت میں منسلک نہ ہوتی تو کسی چیز کا قائم رہنا تو درکنار، شروع سے کوئی چیز وجود میں ہی نہ آسکتی۔

اسلام دین وحدت ہے۔ وحدت کا دوسرا نام ہم آہنگی اور صلح بین الاضداد ہے۔ اسلام نے سب سے پہلے انسان کے نظریہ حیات میں فساد کو رخنہ کر کے امن پیدا کیا۔ جن قلوب پر شرک کی حکومت ہو، ان میں حکمت بھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ حکمت تضاد و تنازع چیزوں میں غیر مرئی اور عقلی وحدت کو دریافت کرنے کا نام ہے۔ از روئے حکمت شرک تمام بھالتوں کا منبع ہے، اور جہالت سے ظلم اور فساد پیدا ہوتا ہے۔ توحید کی تعلیم حکمت کی تعلیم ہے، اور حکمت جہالت اور ظلم کو دور کرتی ہے۔ جس دین نے توحید کو اصل دین قرار دیا، اس نے اپنا نام اسلام رکھا۔ جس نفس میں جس قدر توحید کی معرفت ہوگی اسی قدر اس کے اندر سلامتی ہوگی اور عالم انفس و آفاق کے ساتھ ہم آہنگی پیدا ہوتی جائے گی۔ ایمان کے لفظ کا مادہ بھی امن ہے۔ پچا ایمان اسی کو کہہ سکتے ہیں جو مومن کی طبیعت میں امن پیدا کرے اور انسانوں کے بارے میں اس کو امن پسند بنا دے۔

اسلام جنگ کو نہ مقصود حیات سمجھتا ہے، اور نہ کوئی خوش گوار فعل۔ جہاں تک ہو سکے وہ اس سے بچنے کی تدبیر کرتا ہے۔ کسی بے گناہ کو قتل کرنا جرم منہمک ہے۔ احرام حیات کی تعلیم دیتے ہوئے قرآن نے چند الفاظ میں ایسا حکیمانہ نکتہ بیان کیا ہے جو اس بارے میں اس کے تمام نظریہ حیات کی وضاحت کرتا ہے۔ من قتل نفسا بخیر نفس او فساد فی الارض وکانھا قتل انماں جیسا۔ جو کوئی کسی شخص کو قتل کرے بغیر اس کے کہ اس شخص نے کسی کی جان لی ہو، یا دنیا میں فتنہ و فساد پھیلایا ہو، تو اس نے اپنے اس فعل سے گویا تمام نوع انسان یا تمام انسانیت کا خون کر دیا۔ کسی مذہب، تہذیب یا تمدن کو جانچنے کا ایک سیارہ ہے کہ اس کی تعلیم اور اس کے عمل میں کہاں تک اجتناب حیات پایا جاتا ہے۔ اسلام نے جو جنگ کی اجازت دی ہے وہ فتنہ و فساد کو روکنے کی غرض سے ہے۔ جب قتل کرنے کے بغیر فتنہ رنج نہ ہو سکتا ہو تو اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ الفتنة اشد من القتل۔ قتل بری چیز ہے، لیکن فتنہ اس سے کہیں زیادہ قبیح ہے۔ اس لیے جہاں قتل یا جنگ کے بغیر فتنہ فرو نہ ہو سکتا ہو، وہاں نہ صرف جنگ کی اجازت ہے، بلکہ جنگ کو نافرض ہو جاتا ہے۔ چونکہ صرف رنج فتنہ کے لیے جنگ کی اجازت دی گئی ہے، یہ تاکید کی گئی کہ اتلوهم حتى لا تكون فتنة یكون الدین لله۔ رسول کریمؐ کو جنگ اس لیے کرنی پڑی کہ کفار آزادی ظہیر اور آزادی تبلیغ کی اجازت نہ دیتے تھے، اور مومنوں کو کسب نامی لیے اذیت پہناتے تھے کہ ان کے عقائد مشرکوں کے عقائد کے مخالف ہیں۔ اسی مخالفت میں انھوں نے بڑا فتنہ بپا کر رکھا تھا، مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ ان سے جنگ کرو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ یعنی دین کی تبلیغ اور اس پر عمل کرنے کے راستے میں جو رکاوٹیں ہیں وہ آجائیں۔ جنگ کی سزا فقط ظالموں کے لیے ہے۔ مگر وہ ظلم سے باز آجائیں تو ان کے خلاف توار نہ اٹھائی جائے۔ فان استمد فلا عدوان الا علی الظالمین۔ جنگ کی اجازت صرف ان لوگوں کے خلاف ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی کر کے فتنہ و فساد پھیلاتے ہیں۔ ایسے لوگ مذہب ایم

کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ انما السبیل علی الدین یظلمون الناس ویبغون فی الارض بغیر الحق۔ اور اُنکے لئے اللہ نے ایسے لوگ جنہوں نے اسلام کو قبول نہیں کیا، لیکن مسلمانوں سے دین کے معاملے میں جنگ بھی نہیں کی، اور نہ ان کو گھروں سے نکالا ہے، ایسے امن پسند غیر مسلموں کے ساتھ تم کو احسان اور انصاف کرنے سے خدا نہیں روکتا۔ خدا احسان اور انصاف سے محبت کرتا ہے اور اس کا وارثہ غیر مسلم امن پسندوں تک وسیع کرتا ہے۔ لا ینھکم اللہ عن الذین لھما تلو کھ فی الدین و من یخرج جو کہ من دیار کہ ان تہو وھم و تقسطوا الیھم۔ ان اللہ یحب المقسطین۔ انما ینھکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین و اخر جو کہ من دیار کہ وظاھر و اعلیٰ اخر اجکم ان تو لو ھم و من یتو لھم فاد رتک ھم المظلمون (الممتز)۔

اسلام کا بنیادی اصول یہ ہے کہ دین کے بارے میں کوئی جبر نہیں ہے۔ لا اکراہ فی الدین۔ رسول کریمؐ کی زندگی یا صحابہ کرام کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے کہ کسی شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ اسلام جب اپنی پوری قوت پر تھا اور قیصر و کسریٰ کا تخت الٹ چکا تھا، اس وقت بھی حضرت عمر فاروقؓ جیسے معتد خلیفہ اپنے مسلم غلام تک کو جبر سے مسلمان بنانے کے قائل نہ تھے۔ جب اس غلام نے زمانہ تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تمہیں اختیار ہے، دین میں جبر نہیں ہو سکتا۔ لا اکراہ فی الدین۔ جن دشمنان حق نے رسول کریمؐ پر ہمت لگائی ہے کہ وہ ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لیے پھر رہے تھے، ان کی ترید کے لیے رسول کریمؐ کی زندگی کے کئی واقعات پیش کیے جاسکتے ہیں، جن سے مذہب کے معاملے میں ان کی کمال دوا و لدی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ شرب میں ایک رقم تھی کہ جن عورتوں کے بچے زندہ نہ رہتے تھے وہ منت مانتی تھیں کہ اگر میرا بچہ زندہ رہا تو میں اس کو یہودی بنادوں گی۔ اس طرح کے بہت سے بے بنی نفسیہ کے گھروں میں یہودی مذہب کے پیرو تھے۔ جب اسلام کو قوت حاصل ہو گئی تو ان بچوں کے

مسلمان باپوں نے رسولِ کریم سے عرض کیا کہ ہم اسلام کو یہودیت سے بہتر دین سمجھتے ہیں، اب ہم ان بچوں کو مسلمان بنائیں گے، اور یہودی نہ رہنے دیں گے بہت سے محدثین اور مفسرین اس پر متفق ہیں کہ لا اکسہ فی الدین کی شان نزول یہی ہے کہ خدا نے اجازت نہ دی کہ ان بچوں کو بچہ مسلمان بنایا جائے۔ قرآنِ کریم میں اور بھی کئی جگہ مذہبی آزادی کو اسلام کا رویہ قرار دیا گیا ہے، ومن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر، جس کا جی چاہے مومن بن جائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے خدا چاہتا ہے کہ لوگ مومن بن جائیں اور اس کو یہ قدرت بھی حاصل ہے کہ تمام نوعِ انسان کو بچہ مومن بنائے لیکن خدا اپنی خواہش اور قدرتِ کاملہ کے باوجود دین کے معاملہ میں جبر نہیں کرنا چاہتا ایمان کی اصل ہی یہی ہے کہ اس کو آزادی کے ساتھ افضل سمجھ کر اختیار کیا جائے۔ جیسے ایمان کی ماسیت ہی زائل ہو جاتی ہے۔ جبر سے جو کچھ حاصل ہوگا وہ ایمان نہیں کہلا سکتا، ومن شاء دبت لا من من فی الارض کلہم جمیعاً افاقت تکوین الناس حتی یکونوا موحدین۔ اگر تیرا رب چاہتا تو تمام روئے زمین کے لوگ ایمان سے آتے، کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا کہ مومن ہو جائیں۔ خدا یہ بھی نہیں چاہتا کہ کسی عاقلِ عادتِ نشانی سے لوگوں کو مرعوب اور عاجز کر کے ان میں ایمان پیدا کرے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا جبر ہے۔ کسی معجزے سے وہ کیفیت تو پیدا نہیں ہو سکتی جسے ایمان کہتے ہیں ایمان فقط آزادانہ حقیقت شناسی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ خدا نبی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے کہ شاید تو اس رنج میں گھل گھل کر جان دے دیگا کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اگر ہم چاہیں تو آسمان سے ایک ایسی نشانی اتار دیں کہ اس سے کہے آسکے ان کی گونشیں بھک جائیں، مگر ہم ایسا نہیں کرتے۔ بزرگسی کی کہ دن بھلا نا ایمان آفرینی کا طریقہ نہیں ہے۔ خدا کو ایسے ایمان کی ضرورت نہیں ہے جو معرفت سے پیدا نہ ہوا ہو اور جس کو انسان نے خوشی سے اختیار نہ کیا ہو۔

جبر و اختیار

ایسی تعلیم سے جبر و اختیار کے مسئلے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ یہ سادہ مسلوں اور غیر مسلموں

اور حکماء نے شرق و غرب میں ہمیشہ سے ایک معرکہ الآراء مسلک رہا ہے، قرآن میں تصویر کے دونوں رخ ملتے ہیں۔ آیات کو اگر الگ الگ کر کے پڑھا جائے تو بعض میں سے جبر ٹکتا ہے اور بعض میں سے اختیار۔ خدا خالق کل اور قادر مطلق ہے اس لئے تمام مخلوقات کو خلق کیا اور ہر شے کی خلقت کے قوانین بھی بنائے، جو کچھ وجود میں آیا اس کی مرضی ہے، وجود میں آیا، اس کی مرضی کے بغیر کوئی پتا نہیں چل سکتا۔ ہر عامل کو عمل کی قوت بھی خدا ہی سے عطا کی ہے۔ دنیا میں اور انسانی زندگی میں بے شمار عظمتیں کام کرتی ہیں اور ہر عظمت لائق اپنا معلول پیدا کرتی ہے، لیکن تمام عظمتیں آخر میں ایک علت العللی پر ختم ہوتی ہیں اور یہ علت العللی خود خدا ہے۔ لہذا جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کی گڑیاں آخر میں علت العللی پر منتقلی ہوتی ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیم یہ ہے کہ کائنات اور انسان کی عنان حکومت خدا کے ہاتھ میں ہے، لیکن اس نے انسان کو خاص دائرہ عمل میں اختیار دے رکھا ہے۔ اس کو خیر و شر کے دونوں راستے دکھا دیے ہیں۔ اخلاقی قوانین صحیحہ قدرت اور نفس انسانی کی لوح پر مرقوم ہے، انسان کو اختیار ہے کہ وہ ان دو استقل میں سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ نیکی اور بدی اور اجر و تعزیر کے کائنات مقرر ہیں۔ اعمال انسانی بھی میزان میں اسی اتقان و عدل باری کے ساتھ تقارن رہتے ہیں جو اتقان سکے اجرام فلکیہ کے حرکت اور دیگر طبیعی حوادث میں پایا جاتا ہے۔ تقدیر کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ خیر و شر کے قوانین معین ہیں، ان میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ انسان کو جن حدود کے اندر اختیار عطا کیا گیا ہے وہ بھی مشیت الہی کی بدولت ہے، اس لیے ایک لحاظ سے اس کے ہر عمل کی آخری علت مشیت الہی ہی ہے۔ لیکن خدا انسانوں کی اخلاقی تربیت اور ان کی سیرت کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور یہ اختیار اس کے بغیر ممکن نہیں۔ دنیا میں آدم کی زندگی کا آغاز ہی اختیار کے استعمال سے ہوا۔ خدا نے اس کو شجر ممنوع کے قریب جانے سے منع فرمایا۔ آدم نے اپنی عقل اور اپنے اختیار کا غلط استعمال کیا اس کے بعد شیطان ہوا، اور خدا نے رحیم سے اس کو نہ صرف معاف کر دیا بلکہ خلیفۃ اللہ فی الارض بنا دیا۔

اُدویت کا آغاز اختیار ہی سے ہے خواہ وہ اختیار غلط ہی کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ ماڈیت کے فلسفے نے انسان کو مجبور شخص قرار دیا، مادہ اپنے کورانہ جبر پر عمل کرتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان کا جسم اور اس کا نفس بھی مادہ ہی ہے، اس لیے انسان کا ہر عمل اجرام فلکیہ کی رفتار کی طرح معین و مقدر ہے۔ کوئی شخص کسی حالت میں جو کچھ کرتا ہے، اس کا کرنا ہی لازمی تھا، کیونکہ ماڈی علمتیں لزوم کے ساتھ ساتھ اپنا معلول پیدا کرتی ہیں۔ اگر یہ نظریہ ہو تو اخلاق بے معنی ہو جاتے ہیں، درج و ذمہ کا کچھ مطلب نہیں رہتا، جو نیک ہے وہ نیک ہونے پر مجبور ہے اور جو بد ہے وہ بد ہونے میں معذور۔ ماڈیت نفس کے مستقل وجود ہی کی منکر ہے اس لیے اس کے اندر اختیار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ روحانیت اور الہیت اور توحید کے قائلوں نے بھی جبر کا مذہب اختیار کر لیا۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ چونکہ خدا علیم، قادر، مطلق اور علت العلل ہے، اس لیے دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، اور انسان جو کچھ کرتا ہے، وہ ازل سے معین اور مقدر ہے۔ ان لوگوں نے اس کا کچھ خیال نہ کیا کہ اگر یہ نظریہ صحیح تسلیم کر لیا جائے تو دین کی تمام تعلیم و تحقیق معطل ہو جاتی ہے دین امر الہی پر قائم ہوتا ہے، لیکن کسی مامور کو کسی ایسی بات کا امر کرنا جس کی استعداد اور قدرت نہ ہو اسی میں نہ ہوا، ایک عجیب بات ہے۔ مسلمانوں کی دنیاویات علم کلام اور ادبیات میں دوران انحطاط میں جبر کا عقیدہ مسلمات میں تسلیم کیا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ سب سے عمل اور بد عمل لوگوں کو ایک عذر مل گیا کہ ہم کو ہدایت نہ ہو۔ ہم جو کچھ بھی ہیں خدا ہی کے بنائے ہوئے ہیں، اور جو کچھ ہم سے سرزد ہوتا ہے وہ مشیت ہی کے جبر کے ماتحت سرزد ہوتا ہے۔ تیسرا کہ جس نے یہ

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت سہے غفاری کی
جو چاہیں سو آپ کو یہی ہم کو عیث بدنام کیا
گویا غفاری انسان پر ایک تہمت ہے۔ اب انسان خدا پر تہمت لگاتا ہے کہ فضیلت بدکا
ذمہ دار وہ خود ہی ہے اور خواہ مخواہ ہم بے گناہوں کو بدنام کرتا ہے۔ یہ صرف بدنام

کرتا ہے، بلکہ اپنے کیے کی سزا ہم کو دیتا ہے۔ کرے خدا اور پکڑا جائے انسان سے۔
 در کو سے نیک نامی مارا گزر نہ داؤد۔ کہ تو نبی پسندی تغیر کن قصار را
 حافظ بخود نہ پوشید ای خرقہ فی آلود۔ اے شیخ پاک دامن مہذور و دار مارا
 قرآن میں پیش کردہ اسلام نہ جبری ہے، اور نہ قدری۔ انسانی زندگی میں جبر بھی ہے
 اور اختیار بھی۔ ایک روایت ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے دریافت
 کیا کہ انسان مجبور ہے یا مختار؟ وہ شخص کھڑا تھا، حضرت علیؑ نے فرمایا کہ اپنا ایک پاؤں
 زمین سے اڑھاؤ، اس نے اٹھایا اور ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ پھر فرمایا کہ اس کے
 ساتھ ہی دوسرا بھی اٹھا کر کھڑے رہو، اس نے کہا کہ یہ تو ناممکن ہے، میں ایسا نہیں کر
 سکتا۔ فرمایا کہ پس اسی سے جبر و اختیار کے حدود کو سمجھ لو۔ آئین فطرت یہ ہے کہ خدا
 نے انسان کو خاص حدود میں اختیار دے رکھا ہے، اس کے باہر فطرت کے قوانین
 کا لزوم یا جبر عمل کرتا ہے۔ انسانی زندگی جبر اور اختیار کے بین بین ہے۔ انسان نہ
 مختار مطلق ہے اور نہ مجبور محض۔ جن باتوں میں اس کو اختیار دیا گیا ہے، اس کی ذمہ داری
 بھی اسی حد تک ہے۔ لا ینکف الله نفسا الا وسعہا۔ قرآنی تعلیم یہ ہے کہ نفس انسانی
 آفاق کے آئین کے ساتھ وابستہ بھی ہے لیکن اپنی مستقل حیثیت بھی رکھتا ہے۔ یہ خاک
 زندہ تابع ستارہ نہیں۔ اب تو اوست نے بھی جبر فتن کا عقیدہ بہت کچھ ترک کر دیا ہے
 نہ مادہ قدیم مادین کا مادہ راج اور نہ مادیت کا فلسفہ چٹے انداز پر قائم رہ سکا۔ قدیم فلسفہ
 زیادہ تر جبری تھا، جس کے زیر اثر مسلمانوں کا بھی عظیم کلام جبریت کا شکار ہو گیا۔ جدید
 فلسفے میں برکسوں نے خاص طور پر وجہ ان اور حکمت سے اس کا ثبوت مہیا کیا کہ زندگی
 کی ماہیت ہی آزادانہ تخلیق ہے، اور مادہ اس کے مقابلے میں ایک پس ماندہ چیز ہے
 حیاست تیز رو کے پاؤں پر چڑھی ہوئی گرواں کی رفتار کو معین نہیں کرتی۔ اسلام نے
 انسان کے وقار کو اس کے اختیار کے ساتھ وابستہ کیا ہے۔ جہاں اختیار ہیں وہاں
 اخلاقی ذمہ داری نہیں ہو سکتی، اور جو شخص اپنی زندگی اور اپنے ارادہ کا مالک نہیں ہے
 وہ حیوان کے بھی پست تر ہو جاتا ہے تو حید اسلامی نے انسانوں کو موم موم موم و موم

اور دیوتاؤں کی غلامی سے بچھڑایا۔ اور اس کو اس کا احساس دلایا کہ اس کا منصب محمود
 مالک اور مسخر کائنات ہونا ہے۔ بالفاظ دیگر اس کا وظیفہ حیات خلافت اللہ ہے
 جو جو قوتیں انسانوں کے جائز اختیارات کو سلب کرنے والی تھیں ایک ایک کر کے
 ان کا صفایا کر دیا۔ دیوتاؤں کے علاوہ انسان بھی انسانوں کے مالک اور رب
 بن بیٹھے تھے۔ غلامی اور استبداد کی تمام قسمیں پورے پورے زور شور سے انسانی معاشرے
 میں عمل کر رہی تھیں۔ غلامی کی بدترین قسم ایک انسان کا دوسرے انسانوں کی جان و
 مال اور آپر و مالک ہونا ہے۔ یہ غلامی ہر قوم کی معاشرت کا ایک جزو لا ینفک بن
 گئی تھی، شخصی اور معاشی غلامی تمدن اور معاشیات کا محور تھی، اسلئے جیسے حکیم نے بھی
 کہا کہ یہ ایک فطری چیز ہے جو منسوخ نہیں ہو سکتی ہو اور اسے منسوخ کرنا بھی نہیں چاہیے
 اسلام نے اس کو معاشرے کی ایک بیماری اور لعنت قرار دیا۔ چونکہ یہ مومن ہر مہر ہزار
 سال سے انسانیت کی رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا اس لیے ایک روز میں اس کا
 قلع قمع کرنا محال تھا۔ اسلام نے اس کی تدریجی تیئخ کا پروگرام بنایا۔ زیادہ تر غلامی جنگ
 میں اسیر ہونے سے پیدا ہوتی تھی۔ چنانچہ اس کے متعلق یہ تعلیم دی کہ اسیران جنگ کو یا فدیہ
 سے کر چھوڑ دو، یا احسان کر کے ان کو رہا کر دو، یا جنگی اسیروں کا تہاد لے کر لو۔ حدیث
 شریف میں ہے کہ قیامت کے روز بعض لوگ ایسے مجرم ہوں گے، خدا بن کا منہ دنگھنا
 نہیں چاہے گا۔ ان میں سے ایک گروہ یہ ہو گا جس نے آزاد انسانوں کو غلام بنایا۔
 حضرت عمر فاروقؓ نے غلامی کی تدریجی تیئخ پر عمل کرنا شروع کیا۔ اور حکم دیا کہ کوئی مسلمان
 غلام نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد فرمان جاری کیا کہ کوئی عرب غلام نہیں ہو سکتا۔ بعد میں جب
 خلافت سلطنت میں تبدیلی ہو گئی اور قیصریت اور امپیریت کا دور دورہ ہوا تو اسلام
 کے اور پروگراموں کی طرح اس پروگرام پر بھی آگے قدم بڑھانا تک گیا اور فقہوں
 یہ کہنا شروع کر دیا کہ غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی گئی ہے اور ان کے
 حقوق معین کر دیئے گئے ہیں، لیکن غلامی کا منسوخ کرنا لازمی نہیں ہے۔
 اسی سلسلے میں اسلام کے متعلق ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے جس کو واضح کرنا

لازمی معلوم ہوتا ہے۔ ہر دین کسی قوم میں آتا ہے اور ہر نبی کسی قوم کا فرد ہوتا ہے۔ جس قوم میں کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے وہ قوم اپنا مخصوص مزاج رکھتی ہے۔ نبی کا کام ان کے عادات کو درست کرنا اور قبیح رسوم کا قلع قمع کرنا ہوتا ہے، لیکن اصلاح کا کام اس قوم کے رسم و رواج، روایات و مزاج سے بالکل قطع نظر کر کے نہیں ہو سکتا۔ صحیح کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ قوم اپنی موجودہ حالت میں زیادہ سے زیادہ کتنی اصلاح کو قبول کر سکتی ہے۔ جس طرح فرد کی اصلاح میں تدریجاً برتنا پڑتی ہے، اسی طرح قوم کی اصلاح بھی بتدریج ہی ہو سکتی ہے۔ اصلاح کے متعلق مولانا حاتی ایک نہایت حکیمانہ رباغی لکھتے ہیں۔

دھونے کی ہے اسے ریفارمر جاباتی کپڑے پہنے جب تک کہ دھنبا باقی
دھو شوق سے دھبے کو پر اتار نہ رکھو دھنبا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی
شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ المباحہ میں نبوت کے انداز اصلاح پر لکھا ہے کہ
”دین کے کچھ اذلی اور ابدی اصول ہیں، انہی کا کام یہی ہے کہ ان اصولوں کو اپنی تعلیم
اور اسوۂ حسنہ سے ولی نشین اور قابل یقین بنائے، لیکن ہر نبی کو اس قوم کے مزاج
کا لحاظ کر کے اصلاح کرنی پڑتی ہے جس قوم میں وہ مبعوث ہوا، لہذا جو قاعدے
نبی رائج کرتا ہے ان میں بہت سی باتیں قومی مزاج کو مد نظر رکھ کر جاری کی جاتی ہیں۔
یہ قاعدے اور طریقے دین کا اذلی اور ابدی جزو اور اس کی مہیت میں داخل نہیں
ہو سکتے جس سے یہ لازم آتا ہے کہ دوسری قوم پر جس کا مزاج روایات اور طریقہ زندگی
بالکل مختلف ہو، یہ قواعد جو ان کے قومی اطلاق نہیں ہو سکیں گے۔ کسی نبی نے
اصلاح کا جو قدم اٹھایا اس کے حدود، روایات اور مزاج قومی سے متعین ہوئے
اگر اس قوم یا اس زمانے میں مزید اصلاح کی صلاحیت ہوتی تو اصلاح کا ایک اور
قدم آگے بڑھایا جاتا۔ شاہ ولی اللہ صاحب کے اس خیال کی بخاری شریف کی ایک
حدیث سے تائید ہوتی ہے جس میں رسول کریمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر میری قوم ایسی
جاہل نہ ہوتی تو میں کبھی کے ایک حصے کی تعمیر کو ابراہیمی نقشے پر بناتا۔ مطلب یہ ہے

کہ اس شکست و ریخت اور تجدید و تعمیر سے ان کے جاہلانہ جذبات کو دھوکا لگے گا، لہذا میں نے اپنے ارادے کو ترک کر دیا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کتنی اصلاحی باتیں ایسی ہوں گی جن کے متعلق رسول کریمؐ نے سوچ سمجھ کر اتنا ہی قدم اٹھایا جتنا کہ ان کی قوم برداشت کر سکتی تھی۔ قوم کی برداشت اور اس کی تہذیبی اور تمدنی حالت زیادہ اصلاح کی تجلی کو شش نفع کے مقابلے میں نقصان دہ بنا سکتی ہے، لیکن دین ازلی وہی ہو سکتا ہے جو زندگی کے انتہائی نصب العین کو معین کرے اور ہر اصلاح اس نصب العین کی طرف ایک بڑھتا ہوا قدم ہو، انسانی زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ وہ حسب استطاعت اخلاقِ امیہ اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ تعلقوا باخلاق اللہ مومن کالائکھ عمل ہے۔

اصول و اوامر

اسلامی تعلیمات کے دو پہلو ہیں، ایک اصول اور ایک اوامر۔ قرآن کریم نے اپنا نام قرآن حکیم رکھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل حکمت کی کتاب ہے، حکمت اصل اور بنیادی حقیقت ہے اور احکام حسب ضرورت اس حکمت سے سرزد ہوتے ہیں تاکہ وہ حکمت تنظیم حیات میں بروئے کار آ سکے۔ قرآن نے حکمت کو موعظت پر مرجع سمجھا ہے ادع الیٰ تبدیلی ریدت بالحکمت والموعظة الحسنیٰ جس شخص میں حکمت اور مرجع سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو، اس کے ساتھ وعظ و نصیحت سے کام لیا جاتا ہے اور عمل کے لیے اوامر و نواہی اس کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں

قرآن کریم کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں احکام کی تعداد بہت کم ہے اور اکثر احکام کے ساتھ اس حکمت کو بھی واضح کیا ہے جو کسی حکم کی علت ہے۔ اگر اوامر کی کثرت ہو جائے تو انسانوں کی جائز آزادی بھی بعض اوقات محدود ہو جاتی ہے۔ اسلام کی غرض یہ تھی کہ جہاں تک ہو سکے انسان خدا کو کائنات کے مشاہد سے اور مطالعے اور تفکر و تدبیر سے بچے اور خدا کے احکام کی حکمت بھی اس

پروا نہ ہو۔ اسلام کی معاشرہ و دنیا میں ادیان سننے زندگی کو بہت محدود اور محدود کر رکھا تھا۔ اور انہوں نے کثرت سے اصل دین کو فراموش کر دیا تھا۔ منتصب شخص وہی ہوتا ہے جو اصل کو فراموش کر کے شرع ہی کو اصل سمجھ لیتا ہے اور کسی حکم کی علت اور حکمت کو سمجھنے بغیر اس کی ظاہری صورت کی پابندی کو عین دین تصور کرتا ہے۔ اسلام نے دین کی یہ حقیقت بتائی کہ اللہ بین الیمن۔ دین آسانی کا نام ہے اور رسالت کا مقصد یہ ہے کہ انسانوں نے جو توہمات، روایات اور رسوم کی زنجیروں سے اپنے آپ کو جکڑ رکھا ہے، ان زنجیروں کو توڑ دیا جائے۔ احکام کی قہر و کم سے کم ہو اور زیادہ زور اصول پر دیا جائے۔ حکم کی محض ظاہری پابندی کر کے اس کے باطن اور اس کی حکمت سے غافل رہنے والوں کو تنبیہ کی جائے۔ عبادت کا مقصد بتایا جائے اور ان کے کچھ ارکان اور آداب معین کیے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی تاکید کے ساتھ یہ تلقین کی جائے کہ ارکان و آداب ذرائع ہیں، مقصود اصل نہیں ہیں۔ نماز حقیقی وہ ہے جس میں حضور قلب ہو اور وہ غششا و منکر سے انسان کو روک سکے اور انسان کی طبیعت میں اعمال صالحہ کی رغبت پیدا کر سکے۔ قیام و رکوع و سجود اور قبلہ رو ہونا، اصولی مقصد کے ذرائع ہیں۔ اگر اصل مقصد حاصل نہ ہو، تو اٹھنا بیٹھنا اور آیات کو طوطی کی طرح دہرانا اچھائی کی بجائے برائی کا باعث ہو سکتا ہے۔ چونکہ ارکان فی نفسہ مقصود نہیں ہیں، اسی لیے ارکان کی پابندی میں اسلام نے ایسی شدت اور تنگی نہیں برتی کہ ارکان ذرا دھڑ سے ادا نہ ہوں تو نماز ہی باطل ہو جائے، کھڑے ہو کر نماز کی ادائیگی میں وقت محسوس ہو تو بیٹھ کر پڑھ لی جائے، بیٹھنے میں زحمت محسوس ہو تو لیٹ کر پڑھ لی جائے۔ آخر میں یہاں تک ہے کہ بعض اشارات سے نماز ادا ہو سکتی ہے۔ نماز میں قبلہ رو ہونا، آداب صلوٰۃ میں سے ہے لیکن قرآن کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ لوگ محض کسی سمت ہی کو مقصد میں نہ سمجھ لیں اور اس کو جو ہر صلوٰۃ میں داخل نہ کر لیں، اسی لیے دو تین مرتبہ دہرائے گئے کہ یہ آداب و ذرائع ہیں و اصل یہ ہے اور حقیقت نماز کا جو نہیں۔ آداب کی پابندی مفید ہے لیکن آداب کو آداب ہی سمجھا جائے۔ ان کو اصول

کا ہم وزن نہ بنایا جائے۔ واللہ المشرق والمغرب فاینہما تولوا فشتہ وجہ اللہ
اور اللہ ہی کی ہے مشرق اور مغرب، پس جس طرف تم منہ کرو اسی طرف اللہ تعالیٰ کا رخ
ہے۔ اصل چیز نیکیوں کی طرف سبقت کرنا ہے۔ نماز اور اسی کے ارکان سب اسی
مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ولکل وجہت ہو مولیٰ ہما۔ فاستبقوا الخیرات
ادھر ایک کے لیے ایک ہمت ہے بعدہ کو وہ اپنا منہ کرتا ہے۔ پس تم نیکیوں کی طرف
بڑھو۔

عبادات کی ظاہری صورتیں اور اطوار نیکی کا اصل مقصود نہیں ہیں، نیکی کی ماہیت
یہ ہے کہ حقائق پر ایمان رکھتے ہوئے اعمال صالحہ پیدا کیے جائیں، رحم اور عدل اور
ایشاء اور صبر کی مشق کی جائے۔

نیکی ہی نہیں ہے کہ اپنا منہ مشرق و مغرب کی طرف کر لو، بلکہ اصل نیکی ان کی ہے
جو اللہ اور آخرت اور غرضتوں اور کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے، اور جنہوں نے
اللہ کی محبت میں قربانیوں اور یتیموں اور محتاجوں اور مساکینوں اور مانگنے والوں کو
اپنا مال دیا، اور غلامی سے لوگوں کی گزندوں کو بھڑانے میں مال صرف کیا، جو نماز پڑھتے
اور زکوٰۃ دیتے رہے، جب عہد کیا تو اپنے وعدے کے پورے رہے، تنگی اور تکلیف
اور خوف کے وقت صابر رہے یہی ہوگیا پجائی دے اور پرمہر گار میں۔ (البقرہ ۱۷۷)
آیت ۱۷۷۔

اسلام کے مخالفوں بلکہ بعض مسلمان کلامانے والوں نے بھی اسلام پر یہ اعتراض
کیا ہے کہ اس نے زندگی کی تمام چیزیات کو ایک اہل نظام فکر و عمل میں جکڑ دیا ہے۔
یہ اعتراض حقیقت میں قرآن پر نہیں بلکہ ہماری فقہ کے بعض اصول پر وارد ہوتا ہے۔
قرآن پر اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ مسلمان فقہاء اور علما اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے
زمانے کی ضروریات کے مطابق تفصیلی احکام سکھ دیتے رہے۔ چونکہ
یہ احکام متغیر حالات اور مختلف اہتمام کا نتیجہ تھے، ان میں کثرت باتوں کے متعلق اختلاف
پاسے رہا۔ ہر ایک نے نیک نیتی سے جو سمجھا وہ فتویٰ دیا۔ جب تک مسلمانوں

پر ذہنی جمود طاری نہ ہوا، تب تک فقہاء کے مذاہب کوئی اٹل چیز نہ تھے اور ائمہ فقہاء میں
 کسی کا یہ نشانہ تھا کہ لوگ ان کی تحقیقات اور ان کے فتاویٰ کو شریعت اسلامی کا
 ناقابل تغیر حصہ سمجھ لیں اور اس کے معنوں عن الخطا ہونے پر اسی طرح ایمان لے آئیں
 جس طرح کہ وہ قرآن پر ایمان لائے ہیں۔ مآخضوں نے احکام کو قرآن سے اخذ کرنے کی
 کوشش کی لیکن کہیں کہیں تاویلات پر اختلاف ہو گیا۔ احادیث نبوی سے احکام کے
 استنباط کی کوشش کی لیکن احادیث میں بہت کچھ اختلاف تھا، اس لیے سب فقہاء
 کے لیے ان میں سے متوافق احکام کا استنباط کا رد و شواہد تھا۔ جب مسلمانوں میں فقہ کا
 فقدان ہو گیا تو عوام اور علمائے دین کھانسنے والے بے بصر اور جامد لوگ پہلے فقہوں
 کے پرستار ہو گئے اور وہی صورت پیدا ہو گئی جو قرآن کریم نے یہود کے متعلق بیان کی تھی
 کہ ان لوگوں نے اپنے احبار کو ارباب من دون اللہ بنالیا۔ اس کے بعد لوگ مسلم کہانے
 کی بجائے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی کہلانے لگے۔ مآخضوں نے اپنے اماموں کے اختیار
 اور فتاویٰ کو شریعت اسلامیہ کا جزو لاینفک سمجھ لیا۔ اجتہاد اور اجماع قیاس اور امتحان
 سب کا دروازہ بند ہو گیا۔ اسلام کی شریعت بھی منہ کا دھرم شاستر بن گئی۔
 قرآن کریم میں جو اصولی دین ہیں، وہ وحی الہی اور ابدی اسلام ہیں، اس کے علاوہ جو کچھ
 ہے وہ وقتی اجتہاد ہے جو زمانے کی ضروریات کے ساتھ بدل سکتا ہے۔ اگر اسلام
 ابدی دین ہے تو اس میں ایسی تفصیلات دین کا جزو لاینفک نہیں بن سکتیں جو تمدن اور
 معاشرت کی کسی خاص صورت سے متعلق تھیں۔ اسلام نے جو اصلاحیں کیں ان میں
 سے بعض ایسی تھیں جو معاشرانہ معاشرت کی کسی ہیئت کو مد نظر رکھ کر کیں۔ رسول کریم
 نے اسلام کی تفہیم میں بھی تدریج کے اصول کو مد نظر رکھا اور اس حقیقت کو نظر انداز
 نہیں کیا کہ اسلام کی کھلی اور انتہائی صورت کسی ایک فرد یا قوم میں یکدم پیدا نہیں ہو سکتی
 جب کسی قوم میں کسی صحابی کو عامل اور والی بنا کر بھیجتے تھے تو اسے فرماتے تھے کہ پہلے
 ان سے فقط یہ کہنا کہ خدا ایک ہے، جب تو حیدران کی جگہ میں آجائے تو پھر اس کے
 بعد نماز کی تفہیم کرنا اور اس کے بعد زکوٰۃ دینے کو کہنا۔ اسلام میں جو تدریج افراد

اور اقوام کے متعلق زمانہ رسالت میں درست تھی وہ بعد کے آنے والے تمام زمانوں کے متعلق بھی درست ہے۔ اسلام نے شروع میں جو اصلاحیں کیں وہ اصلی مدارج کے سفر میں بہتر نہ مراحل و منازل کے ہیں۔ اسلام کے متعلق صحیح نقطہ نظر یہی ہے کہ اس کی ہر اصلاح انسان کی آخری بہت فلاح نہیں بلکہ ہر راہ ایک منزل ہے۔ انسان کو خدا تک پہنچنے کے لیے لائق اور منازل کو طے کرنا ہے۔

ہر لحاظ سے طوریٰ برقی تجلی اللہ کرے مرحلہ شوق نہ ہو سٹے

مولانا رومؒ ایک شعر میں مومن کی منزل کے متعلق فرماتے ہیں کہ ”منزلِ ماکبر یا ست“ علامہ اقبالؒ فرماتے تھے کہ مسلمانوں نے اسلام کو کسی ایک زمانے کی معاشرت کا مرادف سمجھ لیا ہے۔ زندگی ارتقا پذیر چیز ہے اس کی آنے والی صورتیں سننے سے آمین کی متقاضی ہوں گی، اسلام غایت حیات اور نصب العین کا نام ہے۔ شرائط مستقیم پر چلتے ہوئے انسان زندگی کے کیا کیا سانچے بد لے گا، تصور میں بھی اس کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔ مولانا چراغ علی مرحوم شریعت اسلام پر بحث کرتے ہوئے اپنی کتاب ”مقدمہ تحقیق الجہاد“ میں لکھتے ہیں: ”ہمارے مخالف ان ہی عارضی احکام یا رعایتوں پر اڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام نے ان نامکمل احکام اور جزوی اصلاحوں کو ایک دائمی اور غیر متغیر قانون بنا دیا ہے۔ جن پر اعلیٰ درجے کی اصلاحوں کی کجائش نہ رہی اور جو ترقی کرنے والے اور شائستہ تمدن کے لیے ایک زبردست روک تھام ہے۔“

کے مفصلہ ذیل احکام میری نظر میں ہیں۔ عورتوں کی ذلیل بہالت کی اصلاح۔ غیر محدود تعداد ازدواج کی تحدید۔ طلاق کی آسانی اور لونڈی، غلام بنانا۔ آنحضرتؐ کے تمام احکام عام اس سلسلے کے ہیں۔ چاند روزہ اور عارضی تھے۔ یا قطعی اور دائمی، جو ان تمدنی خرابیوں کے رفع کرنے کے لیے دئیے گئے تھے، وہ باہم علیحدہ اور مختلف سورتوں میں جایا چھیلے ہوئے ہیں۔ اور ترتیب نزولی کے موافق مرتب نہیں ہوئے۔ اس لیے جو لوگ قرآن کریم کے معنایں پر عمیق نظر نہیں رکھتے ان کے لیے اس بات کا پتہ نہ لگانا ذرا مشکل ہے کہ کون سے احکام بہتر نہ ورمیانی منزل کے ہیں

اور کون سے احکام آخری اور بجائے مندرجہ مقصود کے ہیں۔ عام قانون کے مدون کرنے والوں (فقہاء اور مجتہدین) سے کسی قدر سباحت ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اول تو وہ علی احکام جو عارضی اور بمسئلہ اس درمیانی قدم کے تھے جو اعلیٰ اصلاح کی طرف سے جاتا ہے، آخری اور قطعی سمجھے گئے اور ثانیاً وہ علی احکام جو صحیح اسے عرب کے باشندوں کے مناسب حال تھے تمام زمانوں اور ملکوں کی گردن پر ان کا بار ڈالا گیا۔

پہلی قومیں کھانے پینے کی چیزوں میں حلال اور حرام کو دین کا نہایت اہم جزو سمجھتی تھیں۔ ہر مذہب اور تہذیب میں کھانے پینے کے متعلق کچھ چیزیں طیب اور غیر طیب سمجھی جاتی ہیں۔ بعض اوقات ان کو ایسا سمجھنا کسی حکمت یا تجربے کی بنا پر ہوتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کی تہ میں قومی عادات اور روایات ہوتے ہیں جن کے اندر حکیمانہ اصول کو تلاش کرنا دشوار ہوتا ہے۔ قرآن کریم نے دو تین چیزوں کو غیر طیب قرار دے کر باقی سب کے متعلق ایک عام معقول اصول بیان کر دیا کہ تمام طیبات حلال ہیں یعنی تمام ایسے اطحہ حلال ہیں جو تجربے سے اور طیب کے اصول کے موافق جسمانی و نفسی زندگی کے لیے مفید ہوں۔ لیکن جس طرح ارکان صلوٰۃ کے متعلق یہ واضح کر دیا کہ اس سمت یا اس سمت میں منہ کرنا ہی نیکی نہیں ہے، اسی طرح قرآن کریم نے یہ تعلیم دی کہ اصل حلال و حرام جس پر زیادہ توجہ کر سنے کی ضرورت ہے اس کا تعلق ایمان اور سب سے ایمانی اور نیکی اور بدی سے ہے۔

قل تغالوا اتل ما حرّم ربکم علیکم الا نفسا کواہبہ شیئاً وباللہ الدین احساناً لا تقتلوا اولادکم من خشیۃ املاق طغین نوز قکم وایاھم ولا تقرّوا الفواحش ما ظہر منہا وما بطن ولا تقتلوا النفس البقی حرّم اللہ الا بالحق ذلکم وصما کمدیہ لعلکم تعقلون (الانعام ۴-۱۵۲)۔

اے پیغمبر! لوگوں سے کہو کہ آؤ میں تم کو وہ چیزیں پڑھ کر سنائوں جو تمھارے پروردگار نے تم پر حرام کی ہیں وہ یہ ہیں کہ کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔ اور مال باپ کے

ساتھ احسان کرو، اور مفلسی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، تم کو اور ان کو ہم ہی رزق دیتے ہیں، اور بے حیائی کی باتیں جو ظاہر اور پوشیدہ ہیں ان کے پاس نہ جانا، اور جس کی جان لینے کو اللہ نے حرام کیا ہے، اس کو ناحق قتل نہ کرنا۔ یہ باتیں ہیں جن کا خدا سے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم سمجھو۔

اسی مضمون کے قریب قریب سورہ اعراف میں بھی ہے کہ اصل حرام باتیں تو بے حیائی کی باتیں ہیں، ظاہر اور پوشیدہ گناہکاری اور ناحق دوسروں کے خلاف زیادتی کرنا اور ایسی باتوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا جن کے لیے کوئی سند نہیں اور جن کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حلال و حرام کا تعلق ایمان اور اخلاق سے ہے، کھانے پینے اور دیگر رسوم و عادات اور آداب عبادت کے متعلق جو باتیں ہیں وہ ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس نے ظاہری یا ثانوی حیثیت پر زور دیا اور اصل کو بھول گیا، ایسا ظاہر پرست حقیقی روحانیت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

زاید ظاہر پرست از حالِ ما آگاہ نیست

در حق ما ہر چہ گوید جاسے ہیج اکراہ نیست

اللہ تعالیٰ زبردستی تمام انسانوں کے اطوار و عادات کو یکساں اور یک رنگ بنانا نہیں چاہتا۔ دین کا اصل مقصد نیکی کی طرف سبقت کرنا ہے لیکن جعلنا منکمْ مشرعة ومنہاجاً و لو شاء اللہ جمہکم امۃ واحدة و احدی و لکن لیبلوکم فی ما اتاکم فامتبعوا الخیرات۔ ہم نے تم میں سے ہر گروہ کے لیے ایک شریعت اور ایک راستہ مقرر کیا اور اگر اللہ چاہتا تو تمام نوع انسان میں عبادت و رسوم کی یک رنگی پیدا کر کے، سب کو ایک امت بنا دیتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔ ہر طریقے میں انسانوں کی آزمائش ہو سکتی ہے نیکی اور بدی کی گنجائش ہر طریقے میں نکلی سکتی ہے جو اصل مقصد یہ ہے کہ تمام انسان نیکیوں کی طرف سبقت کریں، خصوصاً اسے مسلمانوں یا انھیں دین کی اس اصل غایت اور نصب العین کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

ایمان اور عقل

اسلام کسی ایسے عقیدے کی تلقین نہیں کرتا جو عقل اور مشاہدہ انسانی کے منافی ہو۔ نبیوں کے اندر ایمان محض عقل اور استدلال سے پیدا نہیں ہوتا، کائنات و حیات کی حقیقت ان پر براہ راست منکشف ہوتی ہے، لیکن جو کچھ ان پر منکشف ہوتا ہے، وہ ایسا نہیں ہوتا کہ انسانی عقل یا انسانی فطرت اس کی تائید نہ کر سکے۔

اسلام دین کو فطرت قرار دیتا ہے اور فطرت اس کو کہتے ہیں جو ہر جگہ اندر اور باہر ہماری و ساری ہے ہر چیز کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، لیکن خدا جو حقیقت کلی ہے وہ فرماتا ہے کہ میں ہی ظاہر اور میں ہی باطن ہوں۔ چونکہ خدا کی ذات و صفات میں کوئی تضاد نہیں ہے، اس لیے ظاہر اور باطن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہو سکتا۔ اسلام و ہدایت کا دین ہے اس لیے وہ حیات و کائنات میں کسی ایسی تضاد کا قائل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی تعلیم میں وحی اور عقل میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ جو بات بھی از روئے وحی کی جاتی ہے اس کے متعلق یہ بھی دعویٰ ساتھ ہی ہوتا ہے کہ اسے انسانوں! اگر تم عقل سے کام لو اور بہالت و تعصب سے اپنی چشم بصیرت کو نابینا نہ کر لو تو تم اس بات کو حقیقت سمجھو جو تمہارے سامنے پیش کی جاتی ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ دین ایمان بالغیب کا بھی تقاضا کرتا ہے اس کا صاف جواب یہ ہے کہ حیات لا محدود ہے جس طرح ہر ظاہر کا ایک باطن ہے، اسی طرح ہر حاضر کے ساتھ غائب بھی ہے، حاضر کم اور غائب زیادہ۔ لیکن اسلام اس ایمان کا متقاضی ہے کہ کوئی انسان اپنے محدود وجود و تجربے کو حقیقت مطلق نہ سمجھے اور یہ عقیدہ رکھے کہ غائب حاضر سے متضاد نہیں ہے اور ہر حاضر ایک غائب کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی کڑیاں اسی حاضر کے ساتھ ملی ہوئی ہیں۔ تمام حکمت حاضر سے غیب کی طرف بڑھنے کا نام ہے۔ سائنس کے دریافت کردہ قوانین کی حکمت کا معیار بھی یہی ہے کہ جو حوادث ابھی بطن مستقبل میں ہیں اور ظہور پذیر نہیں ہوئے ان کے متعلق پیش گوئی کی جاسکے۔ سائنس نے موجودات کے ایک حصے کا مطالعہ کر کے اور اس کے قوانین دریافت کر کے یہ ایمان قائم کر لیا ہے کہ کائنات کے

طبعی پہلو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ لائحہ وادار نامعلوم کائنات بھی انہیں قوانین کی پابند ہے۔ ہر ہمارے عقل اور تجربے میں مستم قرار پانے لگے ہیں۔ سائنس کا عقیدہ بھی یہی ہے کہ ہاضمہ کا صحیح علم غیب سے غیر متوافق نہیں ہو سکتا۔ انفس و آفاق کے عوالم الگ الگ معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ ایک دوسرے سے بے تعلق نہیں ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح وحی و الہام اور عقل میں بھی کوئی تضاد نہیں۔ علوم طبعی اور ریاضیات کے بعض ماہرین نے انکشافات کے متعلق اپنے نفسی تجربات بیان کیے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اپنے علم کے متعلق ان کو بے سعی و کوشش اور بے استدلال ایک الہام ہوا چونکہ وہ دلائل سے پیدا نہ ہوا تھا، اس لیے اس کے ثبوت میں کوئی دلائل ان کے پاس موجود نہ تھے، اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے عرصہ دراز تک بعد میں استدلال کرنا پڑا۔ استدلال اور تجربے نے اس کو صحیح ثابت کیا۔ انبیاء کی وحی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ از روئے وحی زندگی کے بعض اہم حقائق ان پر متکشف ہوتے ہیں۔ عام انسانوں کی عقل کو ان تک پہنچنے میں بہت دیر لگتی ہے، لیکن جب عقل اور انسانی تجربہ ان تک پہنچ جاتا ہے تو وحی سے حاصل شدہ حقائق عین حکمت معلوم ہوتے ہیں۔ ہر ایک انسان مورد وحی و الہام نہیں ہو سکتا، جس طرح ہر شخص سائنس میں نیوٹن اور آئن اسٹائن نہیں بن سکتا۔ عام لوگ اور معمولی سائنسدان ان ماہرین کے انکشافات پر اعتبار کر کے تدریجاً عقل اور تجربے سے ان کی تصدیق کے کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جس قدر سائنس ترقی کرتی ہے، وہ اس ماہر کے الہام کی تصدیق کرتی جاتی ہے۔ قرآن عام انسانوں سے یہی مطالبہ کرتا ہے کہ تم کسی بات کی بجائی کو عقل اور مشاہدے اور تجربے سے پرکھو۔ کائنات کا بغور مطالعہ کرو تو تم کو اس کی کثرت ایک وحدت میں منسلک نظر آئے گی۔ تمہارے پاس عقل اور مشاہدے سے بالاتر ذرائع تحقیق نہیں ہیں، لہذا تم انھیں سے کام لو۔

اسلام سے قبل اکثر مذاہب نے اپنی بنیاد ایسے عقائد پر رکھی تھی جو نہ کسی کی عقل میں آ سکتے تھے اور نہ کسی کے مشاہدے میں۔ کسی نے توحید و تثلیث کا معاہدہ پیش کیا، کسی نے ایمان کی بنیاد تمام تر معجزات پر رکھی جن کے سمجھنے میں انسانی عقل عاجز ہو، قرآن نے

یہ عقیدہ پیش کیا کہ ایمان کو خدا کی عبادت اور سنت سے انھذا کرنا چاہیے۔ لوگ اپنی برائی عادت سے معجزہ طلب کرتے ہیں، اس کے جواب میں قرآن تمام کائنات اور اس کے ہر شعبے کو مشیت و قدرت الہی کا اعجاز قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دیکھو زمین سے چیزیں کس حکمت اور جمال کے ساتھ اُگتی ہیں، ستارے کیسے اپنے مداروں میں حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں، ایٹم کے اعضا اور ماحول کے ساتھ ان کے توافق پر غور کرو۔ فطرت پر غور کرنے سے تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اس میں کوئی چیز عبث نہیں ہے، کوئی عمل بے معنی نہیں ہے، کوئی فعل بے مقصد نہیں ہے، کوئی حادثہ بے آئین نہیں ہے جس کو تم اتفاق کہتے ہو اس کا کہیں وجود نہیں۔ خدا کی مشیت سراپا عقل، سراپا عدل اور سراپا رحمت ہے۔ علم کی کمی ہوتی ہے تو بعض حوادث بے آئین معلوم ہوتے ہیں لیکن علم کی وسعت کے ساتھ نا فہمیدہ بھی فہم کے حدود میں آجاتا ہے۔ کائنات سراپا اظہار بھی ہے اور سراپا اعجاز اور راز بھی۔ ظہور سے بطون کی طرف ترقی کرنا حکمت بھی ہے اور دین بھی ہے۔

ہر کس نہ شناسندہ راز است و گہ نہ

ایں ماہمہ راز است کہ معلوم عوام است

اسلام کے قبل بھی ایسا تھا اور اس کے بعد اکثر لوگ خرق عادات میں خدا کی قدرت کو ڈھونڈتے ہیں۔ اسلام کا بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے انسانوں میں یہ بصیرت پیدا کرنے کی کوشش کی کہ جو کچھ روزانہ کے سامنے ہوتا ہے اس میں خدا کی حکمت کو تلاش کریں۔ کائنات خدا کا صحیفہ قدرت ہے، جو شخص اس صحیفے کو پڑھ کر معرفت نہیں حاصل کر سکتا۔ اس کے لیے کوئی دوسرا طریقہ کار اگر نہیں ہو سکتا ہے جس کو برگ وخت سبز معرفت کردگار کا دفتر نظر نہیں آتا اس کے اندر ری کو سانسید بنا سنے سے ایمان پیدا نہیں ہو سکتا۔ جو شخص مطالعہ فطرت میں اندھا ہے، وہ آخرت میں بھی اندھا رہے گا۔ جو کہانی معلوم ہوتا ہے وہ سارے میں ہوتا ہے خدا اس کے ذریعے سے لوگوں کو حیران اور مرعوب کرنے والے مظاہر فطرت پیش کر سکتا ہے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا اور کہتا ہے

کہ اس سے ایمان آفرینی نہیں ہو سکتی۔ جس شخص کے دل میں ایمان صحیح راستے سے داخل نہیں ہوا، وہ ایسے معجزات کو دیکھ کر مھنسا ہو جائے گا کہ وہ کہے کہ یہ ایمان کا ہیہ ایمان ہی رہے گا۔ اسلام کی خوبی یہ ہے کہ اس نے دین کو فطرت کہا اور حکمت کو خیر کثیر قرار دیا اور عقل کو وحی کا موبد بنایا، مشاہدہ حاضر کو ایمان بالغیب کے حصول کا ذریعہ بنایا اور دین و دانش کے تضاد کو بے عقلی کا نتیجہ سمجھا۔ جن ادیان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ وہ فطرت کی طرف رجوع کرنے سے گھبرائے، علوم و فنون کی ترقی کو اپنے منافی سمجھ کر ان کی راہ میں مزاحم ہو گئے۔ اسلامی تہذیب میں علوم و فنون کی ترقی اسلام کے بنیاد ہی عقائد پر کوئی ضرب نہ لگا سکی۔ طبعی قوانین، نفسی قوانین، خیر و شر کے قوانین سب از روئے اسلام سنت اللہ ہیں اور فطرت اللہ ہیں، جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ولین تعبد لسنة اللہ تبدیلی۔ ان قوانین کو دریافت کرنا حکمت کہلاتا ہے اور قرآن نے اپنے آپ کو حکمت کی کتاب کہا ہے اس حکمت کے مطابق جو عمل ہو گا، وہ عمل صالح کہلائے گا اور جو زندگی اس کے مطابق ہو گی وہ حیات طیبہ ہو گی۔ جس طرح فطرت لاقتناہی ہے، کسی فرد یا قوم کے لیے کسی ایک وقت کا علم کافی نہیں ہو سکتا، اسی لیے مومن کو یہ دعا سکھائی گئی ہے کہ رب زدنی علماً۔ یہ دعا نبی بھی کرتا ہے اور امتی بھی کہونکہ نبی کا علم بھی کسی حالت میں علم کل نہیں ہوتا۔ دوسروں کے مقابلے میں اس کا علم بے شمار زیادہ ہے لیکن علم کی لاقتناہی وسعت کے مقابلے میں نبی بھی اس کو ہمیشہ کم پاتا ہے اور اس میں احتیاط کی دعا کرتا رہتا ہے۔ ادیان کو لوگوں نے غلط طریقے سے پیش کیا، اس لیے بعض حکمت پسند لوگ دین سے بیزار ہو گئے۔ لیکن جو دین اپنے آپ کو حکمت اور فطرت کا مراد قرار دے، لوگوں کو تفکر اور تدبیر کی دعوت دے، اس سے بیزار ہونے کے کیا حتمی۔ مسلمانوں نے نبی بھی بہت سے توہمات کو جزو دین سمجھا ہے۔ بالخصوص غلط فہمیاں مزاج رکھنے والے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ توحید کے خالص عقیدے کو اصل دین سمجھیں اور قرآن نے حیات و کائنات کے تعلق اس عقیدے سے جو کچھ بطور نتیجہ اخذ کیا ہے وہی حکمت سمجھیں اور اسی کو لا کھ عمل بنائیں۔ اسی حقیقت کا نام اسلام ہے اور

باتی سب فسوں و فسانہ سے

جنگِ مقنا دو دولت ہمہ را خدر بند

چوں ندیدند حقیقت را و فسانہ ز دند

اسلام میں گناہ کی ماہیت

اسلام نے مذہب میں جو انقلابی باتیں کہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے گناہ کی حقیقت بتائی۔ اسلام سے قبل مذاہب کا یہ حال تھا کہ ان میں سے اکثر نے زندگی کو سراپا گناہ بنا دیا تھا، یا گناہ کا خوف اس طرح نفوس پر طاری کر دیا تھا کہ لوگ گناہ کے ڈر سے زندگی ہی سے گریزاں ہو گئے مگر عہدِ امت نے زندگی کی ہر آرزو کو گناہ قرار دیا اور اس کا یہ علاج بتایا کہ زندگی کو مطلقاً بے آلودہ کر دیا جائے۔ ہندو دھرم نے یہ سکھایا کہ گناہوں کی سزا بھگتے کے لیے لا تعداد جہنم لینے پڑتے ہیں اور یہ آواگون ایسا ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی روح اس سے نجات حاصل کر سکتی ہے۔ گناہوں کی سزا بھگتے کے لیے بار بار دنیا میں کبھی چوپا بن کر کبھی گدھا بن کر کبھی سور بن کر اور کبھی کتا بن کر آنا پڑے گا۔ دنیا میں جو بے شمار جانور اور حشرات الارض موجود ہیں، ان میں سے معلوم نہیں کتنے انسانوں کی رو میں ہیں جن کی گناہوں کی پاداش میں یہ تبدیلی ہیئت ہو گئی ہے۔ یہودیوں میں بھی گناہ کے تصورات نہایت خوفناک تھے۔ انھوں نے گناہ کو ایسا ہیئت ناک بنا دیا کہ نطشے لکھتا ہے کہ گناہ کا یہ تصور خاص یہودیوں کی ایجاد ہے۔ یہودیوں کے ہاں خدا اس قدر منتقم اور کدینہ توڑ ہے کہ گناہ کی سزا فقط گناہ کرنے والے تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ اس نے والی تین پشتوں کو عذاب میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ تصور مطلقاً انسانِ جاہل و بادشاہوں کے متعلق تھا جس کو یہودیوں نے خدا پر لگا دیا۔ جاہل و سلطان جس شخص سے ناراض ہوتے تھے، سزا فقط اسی کو نہیں ملتی تھی، بلکہ اس کا پورا خاندان یا قتل کر دیا جاتا تھا، یا صلیح اور معصوم سب کو عذاب میں مبتلا کیا جاتا تھا۔ توریت میں ہے کہ خدا کہتا ہے "میں خدا تیرا مالک خدا نے غیور ہوں، جو لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ یہ برتاؤ کرتا ہوں کہ آبا کے گناہ کا

عذاب تیسری چوتھی پشت تک اس کی اولاد کو بھی دیتا ہوں۔ یہودیوں کا گناہ کی بابت یہ تصور کہ وہ اولاد کو ورثے میں ملتا ہے، عیسائیت کا بھی ایک ساسی عقیدہ بن گیا۔ آدم اور حوا اس نے جنت میں جو شیطان کے درغلانے سے شجر ممنوعہ کا پھل کھایا، اس کی سزا یہیں تک محدود نہ رہی کہ ان کو جنت سے نکال دیا گیا، بلکہ ابد الابد تک ان کی اولاد کو اس کی سزا ملتی جائے گی اور دنیا میں جو انسان بھی پیدا ہو گا، آدم کا گناہ اس کی فطرت کا جزو ہو گا۔ قیامت تک تمام عورتوں کو یہ سزا ملے گی کہ بڑی مصیبت سے بچے جنہیں مردوں کی سزاؤں میں سے ایک سزا یہ ہو گی کہ ان کو جنت کے پسینے سے روٹی کمانی پڑے گی۔ اعمال صالحہ سے بھی گناہ کی پر سیاہی واصل نہ سکے گی۔ یہ کہ ایک کے گناہ کی سزا دوسرے کو مل سکتی ہے وہ اس دوسرے سے بھی عقیدے میں بھی موجود ہے کہ مسیح کی مصیبت اور موت انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ہو گئی۔ انسانوں کے گناہوں کا علاج خدا نے یہی کیا کہ اپنے اکلوتے اور معصوم بیٹے کو جینٹ پر چڑھا دیا۔ اس عقیدے میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کا انسانی قربانی کا تصور بھی پایا جاتا ہے اور یہودیوں کا یہ عقیدہ بھی موجود ہے کہ گناہ گار کی سزا معصوم کو بھی مل سکتی ہے۔ ان عقائد کو دیکھیں تو یہودیوں اور عیسائیوں کا خدا نہ عادل معلوم ہوتا ہے اور نہ رحیم، وہ یا جابر سلطان ہے یا وحشیوں کا خوفخوار دیوتا۔

ایسا ان تمام مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی تعلیم پر غور کیجیے کہ اس نے گناہ کو کیا چیز سمجھا۔ انسان میں کئی قسم کی فطری صلاحیتیں ہیں، وہ احسن تعلیم بھی ہے اور گناہ کرنے کے لئے اسے اسفل الناس میں بھی گر سکتا ہے۔ قرآن نے بھی آدم کا قصہ بیان کیا لیکن یہ کہنا کہ آدم سے ایک لغزش ہوئی، اس نے معافی مانگی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا۔ اس کے بعد آدم کی تذلیل نہیں بلکہ اس کی تکریم ملتی ہے، اس کو خدا کا سب سے بڑا انجام بخیر موت عطا ہوئی اور موت کے ساتھ اس کو خلافت الہیہ کا اہل بنایا گیا۔ وہ علم کی بدولت مسجود ہلاک ہو گیا۔ شمس و قمر اور شجر و حجر کو اس کے لیے مسخر کیا گیا۔ اسلام کہتا ہے کہ آدمی کی فطرت ہے کہ وہ ضرور غلطی کرے گا اور جابجا ٹھوکر کھائے گا۔ خدا اسے اس کو دونوں

راستے بتا دیے ہیں، وہ کبھی ضراط مستقیم کو اختیار کرے گا اور اس کا انعام پائے گا اور کبھی راہِ راست سے بھٹک جائے گا تو سزا کا مستوجب ہو گا۔ لیکن خدا انسان کو ہر وقت ہر گناہ پر نہیں پکڑتا، وہ مواخذہ کرنے میں عجلت نہیں کرتا قرآن کتاب ہے کہ اگر خدا سزا میں زود انتقام ہوتا تو دنیا میں انسان کیا کسی جاندار کا قائم رہنا محال ہو جاتا۔ خدا اَلْوَبُّ الرَّحِيمُ ہے، ہزار بار گناہ کرے اور ہزار بار توبہ کرے تو گناہ کا کوئی اثر باقی نہیں رہتا۔ ایک کا گناہ دوسرے کو ورثے میں نہیں ملتا، نہ ایک شخص دوسرے کے اعمال کا کفارہ ہو سکتا ہے لا تزدوا ذرعا و نرا را اخری گناہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ نقصائے مبرم کی طرح انسان کو چھٹ جائے۔ انسان کی زندگی یہ ہے کہ وہ بھلائیوں بھی کرتا ہے اور برائیوں بھی بھولتا ہے برائیوں کو مٹاتی رہتی ہیں۔ ان الحسنات یذہبن السيئات۔ انسان کو خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ لا تقنطوا من رحمة الله۔ اللہ کی رحمت ہر چیز اور ہر عمل پر چھائی ہوئی ہے۔

بازار آہرا پنجہ ہستی بازار آ گر کافر و کبر و بت پرستی بازار آ
 ایں در گہ ماور گہ تو امید می نیست صد بار اگر تو چہ شکستی بازار آ
 جنت اور دوزخ میں جزا اور سزا کے تشبیہی بیانات ہیں۔ جنت کے متعلق قرآن کریم کتاب ہے کہ جنت کی مثال یہ ہے کہ گویا ایک باغ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جنت کی اصل کیفیت جو کچھ ہے، وہ نہ کسی نے آنکھوں سے دیکھی نہ کانوں سے سنی نہ کسی کے قلب میں اس کا تصور گزرا۔ قرآن کتاب ہے کہ جنت تمام ارض و مساوات یعنی تمام موجودات کی ہم وجود اور ہم وسعت ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جنت کوئی مکان یا مقام نہیں بلکہ انفس و آفاق کی ایک کیفیت ہے۔ اس خیال کی تائید رسول کریم کے اس جواب سے بھی ہوتی ہے جو آنحضرت نے حبش کے ایک سفیر کو دیا۔ جب اسی نے پوچھا کہ جنت اگر تمام ارض و مساوات برعادی ہے تو جہنم کہاں ہو گا، فرمایا کہ جب دن طلوع ہوتا ہے تو رات کہاں ہوتی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دن اور رات عالم ارضی کی کیفیتیں ہیں اور جگہ گھیرنے والی اشیائیں ہیں، یہی حال جنت اور دوزخ

کہ جس پر خدا کی عالمگیر رحمت آشکار ہو جائے، اس کے لیے تمام وجود خیر ہی خیر ہے اور جس پر یہ رحمت آشکار نہ ہو، اس کی سبھی کیفیت کا نام دوزخ ہے۔ گویا جنت اور دوزخ حالتیں ہیں جو عرفان اور عدم عرفان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ یہ کوئی مخصوص مقامات نہیں۔ زمان و مکان کا تعلق عالم طبعی سے ہے، عالم طبعی سے ماوراء نہ یہ زمان ہو گا، اور نہ یہ مکان، نہ یہ دیر و زو و اور نہ یہ طول و عرض۔ علامہ اقبالؒ نے فکر اسلامی کی جدید تشکیل کے خطبات میں جنت اور دوزخ کے متعلق یہی لکھا ہے کہ یہ مقامات نہیں بلکہ احوال ہیں۔ شاہ ولی اللہ علیہ الرحمۃ بھی فرماتے ہیں کہ عالم مثال میں نفسی کیفیات اور مجر و تصورات جسمانی اور مادی صورتوں میں رونا ہوسٹنے میں۔ جنت اور دوزخ کی قرآنی مثالوں کو بھی اس نظر سے کہے مطابق احوال نفسی کی صورت پذیرگی قرار دے سکتے ہیں۔

یہ سچ ہے کہ قرآن خدا کے غضب کا بھی ذکر کرتا ہے اور اس کے رحم کا بھی، خدا میں جلال بھی ہے اور جمال بھی، لیکن جلال ذریعہ ہے اور جمال مقصد۔ رحیمیت اور رحمت خدا کے اس کی صفات ہیں۔ ایسا خدا اگر سزا بھی دے تو تہذیبی ہی ہو سکتی ہے، تعذیب نہیں ہو سکتی۔ خدا کی دی ہوئی سزا ایک عملِ جراحی ہے جس میں تکلیف ضرور ہے لیکن وہ ایک اصلاحی عمل ہے اور اس کا عمل راحت کا پیش خیمہ ہے۔ گناہگاروں بلکہ منافقوں کے متعلق بھی رسول کریمؐ کو یقین تھا کہ گناہوں کی کثرت کے باوجود خدا ان پر مغفرت کر سکتا ہے۔ رسول کریمؐ نے بعض اصحاب سے دریافت کیا کہ بتاؤ کہ کوئی مال اپنے بچے کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال سکتی ہے، انھوں نے کہا کہ یہ ناممکن ہے، فرمایا کہ یقین رکھو کہ مال کو جو عجت اپنے بچے سے ہے، اس سے کہیں زیادہ خدا کو اپنے بندوں سے ہے جو سزا رحمت سے سزا زدہ ہو وہ رحمت کی منافی نہیں ہو سکتی۔ مال بابت تاویب اور تعذیب نفس کی خاطر اولاد کو سزا دیتے ہیں، استاد شاگرد کو سزا دیتا ہے، لیکن یہ سزائیں اصلاحی ہوتی ہیں، انتقامی نہیں ہوتیں۔ سزا پانے والے کی تکلیف سے سزا دینے والے کو خود بھی تکلیف ہوتی ہے۔

گناہ کے متعلق اسلام نے جو نقطہ نظر اختیار کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ

اس نے گناہ گاروں کے لیے گناہ کرنے کے دروازے کھول دیے ہیں۔ دین کا کام گناہ کی تخریبی کیفیت اور اس کے دردناک نتائج کو واضح کرنا ہے جو اذروئے قرآن ایک نفسی مرض ہے، ایک قلبی بیماری ہے، لیکن جس طرح خدا نے ہر جسمانی بیماری کا علاج پیدا کیا ہے اسی طرح ہر قلبی بیماری کا علاج بھی ہے اگر بیماری ہوتی اور اس کا علاج نہ ہوتا تو اللہ کی رحمت پر شبہ ہو سکتا تھا۔ غالب نے اس معنوں کو کیا عہدگی سے بیان کیا ہے۔ کتا ہے کہ ادویات، جہادات اور نباتات میں سے بنتی ہیں اور بیماریاں جانداروں کو ہوتی ہیں۔ تدریج تکوین میں خدا نے جہادات و نباتات کو تمام جانداروں اور انسانوں سے پہلے پیدا کیا، گویا علاج پہلے پیدا کیا اور بیماری بعد میں آئی، اس سے خدا کی رحمت کا پتہ چلتا ہے۔

چارہ در سنگ و گیاہ در پنج باحساندار بود

پیش از ازاں کیس در رسد آن رامہیا ساختی

ہاں اگر کوئی انسان اپنی بیماری نہ سمجھے تو علت و معلول کے عام قانون کے مطابق اس کی بیماری میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ فی قلوبہم مرض فزادہم مرضا گناہ یعنی قلبی مرض کا جلد علاج ہو سکتا ہے، بشرطیکہ مریض اس کو مرض سمجھے، خود اس کی تشخیص کرے یا روحانی اطباء سے اس کی تشخیص کرے اور جلد اس کا مداوا کرے۔ اگر ایسا نہیں کرے گا تو قدرتی اضافہ مرض اس کی زندگی کو جہنم بنا دے گا۔

کسی نے یہ بقراط سے جانچ لیا کہ مرض تیرے نزدیک نہیں کیا کیا
کہا دیکھ جہاں میں نہیں کوئی ایسا کہ جس کی دوا حق نے کی ہو نہ پیدا

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں

کے جو طبیب اس کو پندیان سمجھیں (مدرس عالی)

جب گناہ اصرار اور تکرار کی وجہ سے مرض مزمن بن جائے تو گناہ چونکہ قلبی بیماری ہے اس لیے قلب پر سے دوزخ کے شعلے اٹھنے لگتے ہیں۔ دوزخ کی آگ کوئی خارجی مادی آگ نہیں ہے، بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ وہ آگ ہے کہ قطع علی الافئدہ

یعنی دلوں میں سے شعلہ افکن ہوتی ہے۔ لیکن اتنی شدید کناہ کاری اور عذاب آفرینی کے باوجود بھی نہ تو یہ کا دروازہ بند ہوتا ہے اور نہ رجعت کا دروازہ بند اس کے تو اب ورجیم منتظر رہتا ہے کہ یہ عاصی کناہ سے منہ موڑ کر میری طرف رخ کرے۔ ایک بچی تو بہ زندگی کا ایک بیک رخ پھر کر جہنم سے جنت کی طرف لے جاسکتی ہے۔ اسلام نے انسان کی فطرت کا صحیح اندازہ کیا کہ خطا و نسیان اس کے ساتھ لگا رہے گا اور زندگی کا گوارہ بھلائی اور برائی کے درمیان جھوٹا رہے گا۔ زندگی کی عام لغزشیں ایسی نہیں ہوتیں کہ انسان خدا کے خوف اور عذاب کے ڈر سے ہمیشہ لرزہ بر اندام رہے۔ انسان زندگی کی مختلف حالتوں میں بلندی کی طرف ابھرتا اور پستی میں گرتا رہتا ہے۔ کسی آدمی کے متقی یا فلاح یاب ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس نے غلطیاں نہیں کیں یا کناہ نہیں کیے قرآن کہتا ہے کہ خدا کے پاس میزان ہے۔ اس میزان میں بھلائی اور برائی کا ذرہ ذرہ تلسا رہتا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا مدار اس پر ہے کہ ان پٹروں میں سے کونسا پٹرا بھاری رہتا ہے، اگر تائب برائیاں اور سونکیاں ہوں تو بحیثیت مجموعی خدا کے نزدیک یہ انسان نجات یافتہ حکیم الی قورس فرقہ لذتہ کے امام بنے گا کہ جب تک انسان پر سے دیوتاؤں کا خوف زائل نہ ہو، تب تک وہ اطمینان قلب حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے اس نے لوگوں کو یقین دلانا شروع کیا کہ دیوتا انسانوں سے بعض اور محدود نہیں رکھتے وہ دنیا والوں کی زندگی سے بے تعلق اپنے آپ میں مگن ہیں، لہذا ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن جب بعض مذاہب نے دیوتاؤں کے وجود سے انکار کر دیا اور ایک خدا سے واحد پر ایمان لے آئے تو انھوں نے بھی خدا کے قہر کا ایسا بھیا تک نقشہ کھینچا کہ لوگ دیوتاؤں سے چھوٹ کر ایک خدا سے مستقم و قہار کے خوف سے کانپنے لگے، ایسی توحید نے بھی موجدوں کو خوف سے نجات نہ دلائی۔ لیکن قرآن کریم جب کبھی نجات یافتہ انسانوں اور حیاتِ طیبہ والے مومنوں کا ذکر کرتا ہے تو ان کی نفسی کیفیت ہی بیان کرتا ہے کہ لا خوف علیہم ولا

یعنی ان کہ ان پر کسی قسم کا خوف طاری نہ ہوگا اور نہ وہ حزن میں مبتلا ہوں گے۔ دینی اصطلاح میں جس کیفیت کو خوفِ خدا کہتے ہیں اس کا اصل مطلب گناہ اور اس کے نتائج سے بچنا ہے۔ بیماری کے خوف سے انسان صحت کا خیال رکھتا ہے۔ گناہ کی خوف سے انسان اپنے جسم اور کپڑوں کو بچاتا ہے، کسی محبوب کی ناراضگی کے خوف سے وہ کوئی ایسی بات نہیں کرتا جس سے محبت کا تعلق خراب ہو جائے صحیح معنوں میں خدا کا خوف بھی محبت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے نہیں کہ خدا سزا دینے کے لیے آمادہ بیٹھا ہے۔ گناہ خدا سے دوری کا نام ہے اور یہ دوری آپ ہی اپنی سزا ہے۔

بنیادی اسلام مستقبل میں تمام اقوام کا مذہب بننے کی صلاحیت رکھتا ہے

اس مختصر مقالے میں کئی بار دہرایا گیا ہے کہ اصل دین تو حید ہے اور اس کے یقین اور عرفان کا نام ایمان ہے۔ محمد رسول اللہ کی بعثت سے قبل بھی لاتعداد انبیا اور اولیاء اللہ تو حید ہی کی تعلیم دیتے رہے لیکن تمام ادیان میں کسی نہ کسی طرح اس کی صورت مسخ ہوتی چلی گئی۔ شرک کی مختلف قسمیں اس کی جگہ لیتی گئیں۔ اسلام تمام انبیا کی تعلیم کو اسلام ہی کہتا ہے جس سے معلوم ہوا کہ بنیادی طور پر جس چیز کا نام اسلام ہے وہ پہلے پہل محمد رسول اللہ کی تلقین کے ساتھ وجود میں نہیں آئی۔ نوح اور ابراہیمؑ، موسیٰؑ اور عیسیٰؑ سب اسلام ہی کی تبلیغ کرتے رہے۔ شریعت اور منہاج میں تغیر و تبدل ہوتا گیا۔ لیکن اصل میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ ایک تارا در درخت جس کی جڑیں دور تک زمین کے اندر چلی گئی ہیں، اس کا تناقلم رہتا ہے لیکن ہر سال اس میں کچھ شاخیں سوکھ جاتی ہیں اور کچھ شاخیں نکل آتی ہیں، ہر موسم خزاں میں پراسے پتے بھر جاتے ہیں، اور موسم بہار میں نئے پتے نکل آتے ہیں شرارت اور موسم و شاعر ہی شاخیں اور پتے ہیں، جن کے بدلنے سے ہی حیات نکل

میں تری اور تازگی برقرار رہتی ہے۔ رسول کریمؐ کی بعثت کے وقت ادیان کا یہ حال تھا کہ کہیں بھی توحید اصل اور خالص صورت میں نہ تھی۔ ہندو تہذیب و مذہب پر اسلام کے اثرات کی تحقیق میں ایک عالم ہندو مورخ ڈاکٹر تارا چند نے نہایت بے نقیبی سے ایک مقالہ سپر و قلم کیا اور اس مقالے میں انھوں نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد صدیوں تک جو مذہبی تہریکیں ہندو قوم میں پیدا ہوئیں، ان میں توحید کے جو عناصر پاسے جاتے ہیں وہ اسلام ہی کے رہین سنت ہیں۔ ہندوؤں نے وحدت وجود کا ایک فلسفیانہ تصور قائم کر لیا تھا جو فلاسفہ ہی کے کام کا تھا، عام سوسائٹی و پوتا پرست تھی۔ اوتار کا تصور بھی تھا، اور بعض مذہبی پیشوا عین خدا سمجھ کر پوجے جاتے تھے۔ اس طرح اس کٹر مذہبی قوم میں خالص توحید کا تصور غائب ہو چکا تھا۔ توحید کے مسخ ہونے کے ساتھ قوموں کے اخلاق اور ان کے آئین بھی نہایت درجہ خراب ہو چکے تھے۔ عیسائیت کا بھی یہی حال تھا کہ ہندوؤں کی طرح عیسائیوں نے بھی اس بزرگزیادہ انسان کو خدا کا پاک بنی سمجھنے کی جگہ اس کو عین خدا بنا دیا تھا۔ توحید تقسیم ہو کر تثلیث بن گئی تھی اس کے ساتھ ہی توارث گناہ آدم جیسے فاسد عقائد پیدا ہو گئے تھے۔ دنیا کو ناپائدار اور ذلیل سمجھ کر اس کی طرف سے رخ پھیر لینا روحانیت کا عقوود بن گیا تھا۔ ایک طرف ہندوؤں نے دھرم شاستر مرتب کر رکھے تھے، جن میں ہر انسان کا مقام اور اس کے ہر عمل کی صورت معین کر دی تھی۔ آزاد مئی فکر اور آزادی عمل کا نام و نشان نہ تھا، رسوم و توہمات نے مکارم اخلاق کی جگہ لی تھی اور بن خاص مذہبی طبقوں کا اجارہ بن گیا تھا۔ توحید کی بجائے شرک اور اخلاق کی جگہ رسوم و روایات، مذہب و تہذیب کی ہی مسخ شدہ صورت ہر جگہ پائی جاتی تھی۔ بدھ مت میں فرار عن الحیات اور زندگی کے ہر افادی اور ایجابی پہلو کے گریز عرفان شمار ہوتا تھا، خدا اور دنیا اور ماقبت سب وسم و باطل تھے۔ یہودیوں نے اپنے خدا کو ایک قومی خدا بنالیا تھا۔ یہ خدا دیگر اقوام کے اگر کچھ واسطہ رکھتا تھا تو وہ معاندانہ تھا۔ انبیاء کی دسی ہوئی شریعت میں اپنے توہمات اور شعار کا بے شمار

اختلاف کر کے اس سب پلندے کو دین کہا جاتا تھا۔ یہاں بھی دین کی اجارہ داری تھی دین کا باطن غائب ہو گیا اور کچھ مسخ شدہ سبے جان ظاہر رہ گیا تھا۔ اس ظاہر سے سرور تجاوز کفر کہلاتا تھا۔ مسیح علیہ السلام نے یہودیوں کی اس ظاہر پرستی کے خلاف شدید احتجاج کیا اور بتایا کہ خدا تک نظر منتقم نہیں ہے بلکہ سراپا محبت و رحم ہے اخلاق تزکیہ باطن کا نام ہے، رسوم و شائر اور قواعد کی ظاہری پابندی دین کی اصلی حقیقت نہیں ہے۔ ہر قوم نے اپنے تئیں خدا کی مخصوص قوم سمجھ لیا تھا۔ یہودی کہتے تھے کہ بہشت ان کے لیے مخصوص ہے، وہ جہنم میں نہیں ڈالے جائیں گے، جہنم کی آگ ان کو چھوئے گی بھی تو چند روز تک۔ عیسائیوں نے تو حید کو تثلیث اور روحانیت کو رہبانیت بنانے کے بعد یہودیوں کی طرح نجات کو اپنے لیے مخصوص کر لیا تھا۔ خدا تعالیٰ پر ایمان اور اعمال صالحہ نجات کے لیے کافی نہ تھے، ہر جگہ مذہب، صداقت اور نجات کی اجارہ داری بن کر رہ گئی تھی۔ ہر ایک اپنے مخصوص اور منتخب گروہ کے علاوہ تمام نوع انسان کو جہنم کا ایندھن سمجھتا تھا۔

اسلام نے نوع انسان پر جو احسان کیا وہ یہ تھا کہ مذہب کو ایک نہایت سادہ حقیقت کے طور پر پیش کیا اور بتایا کہ دین اتنا ہی ہے کہ انسان کو اس کا احساس ہو کہ اس کائنات کا ایک خالق و ناظر ہے، عاقل بھی ہے عاقل بھی اور رحیم بھی موجودات کا اگر عقائد مطالعہ کیا جائے تو یہ یقین پیدا ہو سکتا ہے تمام خلق عیال اللہ ہے۔ کوئی قوم خدا کی مخصوص قوم نجات کی اجارہ دار نہیں ہے۔ جو شخص خدا کی طرف رخ کرے زندہ بسر کرے گا، اس میں خدا کے صفات کا عکس بھلنے لگے گا خدا نے حکیم پر نظر جمائے رکھنے سے اس پر موجودات کی حکمت منکشف ہوگی، جس کو قرآن خیر کثیر کہتا ہے۔ اس کو جو میں کل، قطرے میں دریا اور ذرے میں آفتاب دکھائی دے گا۔ اسی طرح خدا کے عدل اور رحمت پر یقین رکھنے کی وجہ سے وہ خود بھی عادل اور رحیم بنتا جائے گا۔ خدا کے اسلامی تصور سے وہ صالح اور محسن بن جائے گا۔ اس طرح کا ایمان رکھنے والا زندگی کو مہمل نہیں سمجھے گا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ حیات بعد الموت کا بھی قائل

ہو گا۔ خدا کے رتبہ و رحیم جس کا کام پرورش کرنا اور مخلوق کی بقا اور صلاحیتوں کے لیے مواقع اور اسباب پیدا کرنا ہے، وہ انسانوں کو پیدا کر کے فنا نہیں کرتا جائے گا اگر فرد کی مرگ و مرگ و دام ہو اور جہانی موت کے ساتھ اس کے نفس پر بھی فتنے و مصلحت طاری ہو جائے تو اس کے لیے یہ معنی ہوں گے کہ خدا نے خالق ہے اور نہ رب اور نہ رحیم ہے۔ ہر تکوین اور ہر آفرینش ایک فعلِ حثیت ہو جائے گی۔ اخلاق کے اقدار اور نیکی کے نتائج اگر فانی اور آئی جاتی ہیں تو اخلاقی احساس کی بنیادیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ اسلامی توحید سے اخلاق فاعلہ اور بقائے روح منطقی نتائج کے طور پر اخذ ہو سکتے ہیں۔ سب کا خدا ایک ہے۔ اس لیے خدا کا قانون سب کے لیے مساوی ہے۔ اسی میں اقوام اور مل کی کوئی رو رعایت نہیں۔ فطرت کے طبیعی قوانین سب کے لیے مساوی ہیں اسی لیے روحانی اور اخلاقی قوانین بھی سب کے لیے برابر ہیں۔ اسلام میں حق اور صلاح و نجات کی صلاحیت عام ہے۔

خدا کی مغفرت اور جنت محدود نہیں کہ اس میں بس ایک چھوٹے سے گروہ کے لیے ہی جگہ ہو۔ اسلام کا خدا رب العالمین ہے، فقط رب المسلمین نہیں ہے۔ یہ انصاری نہیں، رب الیہ و نہیں ماسی طرح اس کا رسول رحمت العالمین ہے۔ خدا نے شعوب و قبائل اور مل بنائے، ان کی تدریجوں اور ان کے شعائر میں کم و بیش فرق ضرور ہے۔ گاہیکہ ان کی شکلوں، ان کے ماحول اور ان کی آب و ہوا میں فرق ہے، اس فرق کی وجہ سے وہ پہچانے جاتے ہیں، لیکن بنیادی اطلاق میں انسانوں کو متفق ہونا چاہیے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا
 إِنَّ الْأَوَّلَ وَالْآخِرَ وَالْبَاطِنَ وَالظَّاهِرَ وَالْغُيُوبَ وَالْخَبِيرَ وَالْجَبَّارَ وَالْمُتَعَدِّ وَالْمُتَعَدِّ وَالْمُتَعَدِّ
 ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہاری شاخیں اور قبیلے مقرر کیے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔

رسوم و رواج میں تم مختلف الطوار پر تو گئے، لیکن سب کا رخ نیکیوں کی طرف رہنا چاہیے۔

اگر یہ بات موجود ہو تو ہر مذہب و اسے اور ہر قوم کو حیا سنت طیبہ اور نجات اخروی حاصل ہو سکتی ہے۔ اعلیٰ چیز احسان اور اخلاق ہے۔ و سادھو الیٰ مقصود من ربکم و الجنة عرضھا السموات والارض اعدت للمتقين الذین یستقون فی السوا والاضواء والکافین الغیض والعافین عن الناس ط و اللہ یحب المحسنین والذین اذا فعلوا فاحشۃ او ظلموا انفسہم ذکر اللہ فاستغفر والذین انوبوا عن الذنوب و من یغفر الذنوب الا اللہ و لعلی ما فعلوا و یصلحون۔

اور اپنے پروردگار کی مغفرت اور جنت کی طرف دوڑو جس کی وسعت زمین و آسمان کے برابر ہے اور وہ ان پر ہزار گاروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو آسودگی اور تنگی دونوں میں خرچ کرتے ہیں، غصے کو دبا سکتے ہیں اور لوگوں سے دور گذر سکتے ہیں۔ اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان سے کوئی برے حیاتی سرزد ہو جائے اور اپنے نفس پر ظلم کریں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہ معاف کرنے والا کون ہے، اور جو سب سے بڑا کام کر سکتے ہیں اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اسلام دین فطرت ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ جو فطرۃ انسان میں پیدا کرنا چاہتا ہے، وہ انسان کی فطرت صحیحہ سے پیدا ہو سکتی ہے۔ دین فطرت ہی تمام نوع انسان کا دین بن سکتا ہے۔ لیکن خدا اکتاہے کہ تمام نوع انسان امت واحدہ نہیں بن سکتی، جس سے معلوم ہوا کہ امتیں یا ملتیں کم و بیش اختلاف احوال اور تنوع اطوار کے ساتھ ہمیشہ باقی رہیں گی جس طرح خدا نے اختلاف الاولاد والسنہ کو اپنی آیات قرار دیا ہے، اسی طرح یہ اختلاف بھی ان آیات میں شمار ہو سکتا ہے کہ مختلف ملتوں میں عبادت اور شرائع میں گونا گویا ہو، تمام نوع انسان از روئے فطرت اپنے آپ کو اطوار میں یکساں نہیں ہو سکتی۔

گنہگاروں سے ہے روئی چین لئے ذوق اس چین کو ہے زیب اختلاف ہے
 رسول کریم ﷺ نہ صرف توحید کی تعلیم دی اور اس کو معقول اور فطری انداز میں
 پیش کیا بلکہ خاص شاعر پر ایک گروہ کی تنظیم بھی کی، اس میں ایک خاص قسم کا ڈسپلین
 قائم کیا۔ اس تمام ڈسپلین کا اصلی مقصد وہی ہے جو دین کا اصلی مقصد یعنی توحید کے
 عقیدے اور اعمال صالحہ کو استوار کرنا۔ لیکن خدا نے دیکھا کہ موحدا افراد دیکھا و بیان
 میں بھی پاسے جلتے ہیں، چین کا عقیدہ توحید بھی درست ہے اور ان کے اعمال بھی
 صالح ہیں۔ بعض ایسے لوگ اپنی سوسائٹی کی روایات کی وجہ سے اس مخصوص جماعت
 میں داخل نہ ہو سکے، جو رسول کریم ﷺ تیار کی تھی۔ اسلام کی فراخ دلی یہ ہے کہ ایسے افراد
 کے متعلق اس نے نہایت درجہ روا داری برتی ہے، ان کے ایمان اور ان کے
 اخلاق کی تعریف کی ہے۔ ان کو اسلام میں اسی طبقہ میں داخل کیا ہے، جس نے خدا کی
 طرف اپنا رخ کر کے زندگی بسر کر دی اور وہ چین تھے ایسوں کے لیے بھی قرآن میں وہی
 الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو اولیاء اللہ کے لیے استعمال ہوتے ہیں: لا خوف علیہم
 ولا هم یحزنون۔ اور وہی قرآن میں وہ چین افراد وہ قسم کے ہو سکتے ہیں، ایک
 وہ جن کو محمد رسول اللہ کی رسالت کو کما حقہ سمجھے گا موقع ملا اور وہ نبی کی مقرر کردہ
 شریعت پر عامل ہو سکے، دوسرا وہ طبقہ جو معاشرتی، روایاتی یا تاریخی مجبوری کی
 وجہ سے اس مخصوص ڈسپلین میں نہ آ سکا، لیکن وہ جہاں بھی رہا، موحدا اور اس کے
 اخلاق صالح رہے۔ اس نے اسلام کچھ اپنی فطرت اور کچھ اپنے مقتدرے نبی کی نبوت
 سے حاصل کیا۔ وہ عبادت کرتا ہے، لیکن اس کی عبادت میں مسلمانوں کی صلوات کے
 ارکان اور پابندی اوقات نہیں، وہ ہمارے مشفقون پر عمل پیرا ہے، غریب
 اور مسکینوں اور یتیموں کی بھلائی کے لیے اپنا مال، اپنا وقت، اور اپنی خوشنود بھی
 صرف کرتا ہے، لیکن اس کی خیرات مسلمانوں کی مقرر کردہ ذکوۃ کے نصاب کے
 مطابق نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ ذکوۃ مخصوصہ سے کہیں زیادہ خیرات کرتا ہو۔ وہ
 عہد کا پابند ہے، اور جیسا کہ قرآن کریم نے فرمایا ہے، ایما ینہی ہے کہ اگر کوئی

کا واپس اس کے پاس امانت رکھو اور تو اس میں ایک جہت کی خیانت نہ کرے۔ کوئی
 نئی بات آپ کو منوانے نہیں آجی بلکہ خدا پر یقین اور اخلاق صالحہ کی تعلیم کے لیے آتا
 ہے۔ اگر اس نئی کی امانت اور جماعت کے باہر کچھ لوگ ایسے ملتے ہیں جن میں وہ باتیں
 موجود ہیں، جو اہل مقصود ہیں تو انہیں یہ نجات کا دروازہ بند کرنا حد درجہ کی
 تنگی نظر ہوگی۔ یہودیوں اور عیسائیوں اور ہندوؤں نے یہی تشکی نظر پیدا کر لی ہے
 وہ کسی ایسے شخص کو جو موجد اور صالح بھی ہو، مستحق نجات نہیں سمجھتے تھے، جو حرف
 بحرف ان کے تمام جزئی عقائد اور ان کی شرائع کا پابند نہ ہو۔ اسی تنگ نظری اور
 دین کی حقیقت سے بے گمان ہونے کی وجہ سے کفار نے انہیں کہہ کریم جیسے موجد
 اور امین کو بھی مستحق نجات نہ سمجھا۔ قرآن نے جایا دین میں اس تنگ نظری کی
 مذمت کی ہے۔ جن گروہوں سے اسلامی جماعت برسرِ پیکار تھی ان کی بابت بھی
 قرآن نے یہ تعلیم کی کہ ان میں سب افراد ایک ہی طرح کے نہیں ہیں، ان میں
 سے بھی تم کو مستحق لوگ ایسے ملیں گے جو بڑے نیک اور خدا پرست ہیں۔ دین
 کی بابت یہ وسعت تعلیم قرآن میں جایا پھیلی ہوئی ہے اس کو ایک جگہ مختلف
 مقاموں کا نام لے کر وضاحت کے ساتھ یکجا کر دیا ہے تاکہ دین کے
 متعلق اسلام کے نقطہ نظر میں کوئی شبہ نہ رہے۔

ان الذین آمنوا والذین ہادوا والنصارى والمجوسی
 احسن بالیہود والیہود الاخری و احسن بالصالحین عند ربہم
 ولا خوف علیہم ولا هم یحزنون " وہ لوگ جو نبی کریم کی خاطر
 مومنین کی جماعت میں داخل ہوئے اور وہ لوگ جو یہود ہیں یا نصرانی ہیں یا
 صابئی ہیں اگر ان میں یہ بنیادی باتیں پائی جائیں، کہ وہ اللہ اور یوم آخرت ایمان
 رکھتے ہیں اور ان کے اعمال صالح ہیں، تو ان کی بھی نجات یقینی ہے۔ یہ بھی
 خدا کی مشرقت کے واسطے ہے، تاکہ جو لوگ ایمان اور عمل صالح
 کی حقیقت ان میں موجود ہے۔

جن مسلمان علمائے اسلام کو اسی طرح تنگ کرنے کی کوشش کی ہے، جس طرح کہ دیگر ادیان نے اپنے آپ کو محدود و محدود کر دیا تھا، ان کو قرآن کریم کی ان آیات سے بہت پریشانی ہوتی ہے، اور وہ اپنی کھینچا تانی کی تاویلات سے قرآن کریم کی اس دست کو اپنے قلب کی تنگی میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔ ان علماء کا حال وہی یہود و ہنود والا حال ہے۔ خدا تو کھول کھول کر عطف کی واو لگا رکھا کرتا ہے کہ جو عقیقتیں خاص مومنوں کی جماعت سے باہر ہیں، ان میں بھی اگر یہ اساسی باتیں پائی جائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ بھی راہ راست پر ہیں۔ لیکن علماء نے یہ گنا شروع کر دیا کہ ایک فاسق و فاجر جو مسلمانوں کی جماعت میں داخل ہے وہ کمال و ربیعہ کے اخلاقی صالحہ واسطے افراد سے جو غیر مسلم جماعتوں میں ہوں افضل و ارفع ہے۔ گنا گادی کے باوجود مسلمان کی نجات کی توقع ہو سکتی ہے لیکن خیر مسلم اعمال صالحہ کے باوجود بھی جہنم کا ایندھن ہے۔ یہودی بھی ایسی ہی باتیں کرتے رہے اور اسی قسم کی اجارہ داری کے مدعی رہے۔ قرآن کو اس تنگ نظری کی جا بجا مذمت کرنی پڑی، لیکن شرمی قسمت سے قرآن حوالہ جماعت خود اسی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔ ایک صاحب علم ڈاکٹر عبدالحکیم پٹے مرزا غلام احمد قادیانی کا مرید تھا۔ ایک جب اس کو مرزا صاحب کے دعاوی غلط معلوم ہوئے تو اس نے بیعت توڑ دی۔ لیکن اس جماعت کے ایک نہایت معتبر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب سے معلوم ہوا جو خود بھی اس جماعت سے نکل چکے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالحکیم کا جماعت احمدیہ سے جو اختلاف ہوا وہ اور امور کے علاوہ اسی آیت کی تفسیر کے متعلق تھا۔ وہ اس آیت کے معانی اور واضح معنوں کو صحیح سمجھتا تھا کہ بعض غیر مسلم بھی جن میں یہ بیان کردہ صفات پائے جاتے ہیں نجات یافتہ ہیں۔ احمدی جماعت کے علاوہ عام مسلمان علماء بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ محض توحید اور اعمال صالحہ سے نجات نہیں ہو سکتی ہے۔ یہ عقیدہ مذہبی خیرگیوں میں سے ایک فکر ایک کے امام بنے جو بڑے اچھے مثالی لوگ ہیں اس آیت پر ایک مفقود فقرہ قلم کیا ہے کہ اس آیت کے

مذہبوں میں لوگوں نے جو وسعت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے وہ دین کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے، اور قرآن کریم پر سب سے بڑا ہتھکنڈا ہے۔ افسوس ہے کہ اب مسلمان بھی اپنے مخصوص عقائد و شرائط و طریق عبادت کی بنا پر اسلام کو ایک فطری اور عالمگیر دین بنانے میں ویسی ہی رکاوٹ بن گئے ہیں جیسی کہ قبل اسلام کی تنگ نظر ملتیں تھیں۔ ان کے نزدیک نسلی مسلمان ہونا، یا مروجہ شمار کی مسلمان ہونا اور عقائد کے متعلق کچھ نہ بانی اقرار اور ظواہر شیعہ و عبادت کی پابندی قلمی طور پر موجد اور غلط و صالح ہونے کے مقابلے میں افضل ہو گئی ہے۔

حالی میں سویڈن سے ایک مشہور اخبار کا نمائندہ پاکستان میں فقط اس غرض سے آیا کہ وہ سمجھنا چاہتا تھا کہ اسلام کا نظریہ حیات کیا ہے، اور اس نظریہ حیات پر کس طرح ایک مٹنی پسند اور مذہب و مملکت کی بناء کی جاسکتی ہے۔ وہ مجھ سے بھی ملا اور کہا کہ میں موجد ہوں، اور دہریت کو غلط سمجھتا ہوں، مغرب کی بادہیت، دہریت اور مادہی اشتراکیت سے بیزار ہوں، میں نے اسلام کا نقطہ نظر، علم و عمل اور جماعت و مملکت کے بارے میں سمجھانے کی کوشش کی اس کو سن کر اس نے کہا ہم جیسے عیسائیوں اور تم جیسے مسلمانوں میں کیا فرق ہے، خدا کے بارے میں ہم ایک ہی عقیدہ رکھتے ہیں اور اعمال صالحہ کی بابت بھی ہم بہت کچھ متفق ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ دنیا کی تمام موجد جماعتیں یا افراد ایک متحدہ عہاد دہریت اور مادہیت کے خلاف قائم کریں۔ ہم میں اور تم میں دین اور اخلاق کی بنیادی باتیں تو مشترک ہی ہیں۔ کیا ہم اس اشتراک عقائد کی بنا پر اشتراک عمل پیدا نہیں کر سکتے۔ میں نے اس کو جواب دیا کہ تم کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ اسلام نے تیرہ سو سال پیشتر ایسی صلاحیتیں تمام موجدوں کو دی تھیں کہ وہ تم اور ہم کو حید اور اعمال صالحہ کی بنا پر اشتراک عمل سے کام کر لیں یہو واد نصاریٰ نے اس دعوت کو قبول نہ کیا، لیکن اسلام کی طرف سے یہ صلاحیتیں عام ہمیشہ کے لیے موجود ہیں۔ اگر تم اس پر لپیک ہو تو یہ عین غنڈہ سائے اسلام ہے۔

ہماری طرف سے پورا تعاون ہو گا کیونکہ یہ اسلام ہی کی دعوت ہے۔

ایک مسلمان مقالہ نگار نے تمام ایسے غیر مسلموں کو منافق قرار دیا ہے جو اسلام کے مزاج ہیں، اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں، لیکن اعلان کر کے مسلمانوں کی جماعت میں داخل نہیں ہوتے۔ کاروائی نے تمام انبیاء میں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منتخب کر کے بظاہر دعوت قرار دیا۔ لیکن مسلمان نہیں ہوا۔ گہن نے اسلام کی تعریف کی اور سچیت کی مذمت کی لیکن مسلمان نہیں ہوا۔ زمانہ حال میں ہزاروں مسلمان اسلام کے متعلق کہا کہ مستقبل میں نوع انسان کا دین اور ادیان کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ مشابہ ہو گا۔ اتنا کہنے پر بھی اس نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان نہ کیا۔ حال میں انگلستان کے متبر مورخ ٹائٹل نے لکھا ہے کہ اسلام نے انسانیت کے ایسے اہم مسائل حل کیے ہیں جن کے حل کرنے میں عیسائیت اور مغربی تہذیب کو کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے باوجود بھی مسیح کا یہ نام لیا، اعلان کر کے مسلمانوں کی جماعت میں شامل نہیں ہوا۔ اس قسم کے سینکڑوں اہل مغرب ہیں جو اسلام کی حقانیت کے اردوئے تحقیق قائل ہو گئے۔ ان میں سے بہت سے پتھرے اپنے دین کو بدل کر اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے۔ زیادہ تر اپنی ملت میں ہی داخل رہے۔ لیکن اپنی ملت کو اسلام کی توحید اور اخلاق فاضلہ کی طرف توجہ دلاستے رہے۔ یہ کس قدر تنگ دلی اور تنگ نظری ہے کہ ایسے بے تعصب لوگوں کو ریاکار کہا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں یہودیت اور ہندوئیت کا عقیدہ جاری و ساری ہے۔ مسلمانوں کی اپنی جماعتوں کی حالت ہر جگہ ابتر ہے۔ نہ دین کے بارے میں ان کی بصیرت میں نور رہا ہے، اور نہ وہ اپنی دنیا کو درست کر سکے ہیں۔ اس کے باوجود یہ توقع رکھتے ہیں کہ دنیا کا ہر موجد و مصلح اعلان کر کے ان کی اس فرسودہ جماعت میں ضرور داخل ہو، اور جب تک چند محضوں نے ظواہر کا پابند نہ ہو جائے تب تک نہ اس کی نجات ہو سکتی ہے اور نہ کسی فاسق و فاجر ظاہری مسلمان پر اس کو ترجیح ہو سکتی ہے۔

کلیات و جزئیات

حکمت کلیات کا نام ہے۔ حیات و کائنات میں اشیا و حوادث کی کثرت ہے۔ لیکن یہ کثرت ہر جگہ آئین و قانون میں منضبط اور منسلک ہے۔ حکمت کثرت کے اندر وحدت کا عرفان ہے یا جزئیات کے اندر ان کلیات کی تلاش ہے جو قانون ہونے کی وجہ سے غیر متغیر ہیں۔ اشیا اور حوادث میں ہر لحظہ تغیر ہوتا ہے۔ اشیا کے اندر کون و فساد ہے۔ وہ بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں کیا تغیر پذیر نہیں ہوتے۔ جو علوم حکمت کی پیداوار ہیں وہ قومی، نسلی اور جغرافیائی تفریقات سے ماورائی ہیں۔ ریاضی سب اہل علم کے لیے مساوی ہے طبیعیات میں قومیت کو دخل نہیں، اس میں کسی قوم کا اجارہ نہیں چلے گا یہ ضرور ہوتا ہے کہ کسی وقت ایک قوم اور کسی وقت دوسری قوم تحقیقات میں دوسروں کے مقابلے میں پیش قدمی کرتی ہے۔ علوم و فنون نے دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک نوع انسانی کو مسلمات پر متحد کر دیا ہے۔ اخلاقیات کے بنیادی اصول بھی تمام مذاہب قوموں میں بہت کچھ مساوی ہیں۔ دین کا کام دنیا میں فساد کو مٹانا اور امن و آشتی کو ترقی دینا ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ دین ہی نے نوع انسان کو متضاد گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اور ایک گروہ دوسرے گروہ کے جان و مال و آبرو پر ڈاکہ ڈالتا جائز سمجھتا ہے۔ اس وقت دنیا میں دو قوتیں طاغوتی کام کر رہی ہیں۔ ایک وطن پرستی قومیت اور دوسرے مذہبی تعصب۔ وطن پرستی نوع انسان کی وحدت کی قائل نہیں۔ اسی طرح مذہبی تعصب بھی وحدت دین سے گریز کرتا ہے۔ اسلام مذہب کو حکمت اور فطرت قرار دیتا ہے، اور حکمت و فطرت میں کلیت اور ہمہ گیری ہوتی ہے۔ جب کوئی دین غیر فطری عقائد قائم کر کے اپنے گروہ تعصب کا ایک حصار کھینچ لے تو اس دین میں عالمگیر ہونے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ دین کو حکمت کی طرح عالمگیر ہونا چاہیے اور وہ ایسی صورت

میں ہو سکتا ہے کہ اس کی بنیاد ایسے کلیات پر ہو جو تمام موجودات پر حاوی ہیں اور تمام انسانوں پر اس کا مساوی اطلاق ہوتا ہے۔ جس طرح نیشنلزم کا علاج بین الاقوامیت اور وحدت انسانی کا احساس ہے، اسی طرح مذہبی تعصب کا علاج یہ ہے کہ مذہب کے ان کلیات پر نوع انسان کو متحد کیا جائے جو عین فطرت ہونے کی وجہ سے سب کے لیے قابل قبول ہوں۔ اتحاد کلیات ہی میں ہو سکتا ہے، جزئیات میں اتحاد ناممکن ہے۔ نوع انسان کے لیے یہ فطری بات ہے کہ ہر انسان کو غذا ملنی چاہیے لیکن تمام افراد اور تمام اقوام کے لیے ایک غذا بخویر نہیں ہو سکتی، ہر فرد اور ہر قوم اپنے مزاج اور اپنے ماحول کے مطابق اپنی غذا معین کر لیتا ہے اور حسب ضرورت اس میں تغیر و تبدل کرتا ہے۔ اسی طرح لباس کا حال ہے۔ تمام مذہب انسان کسی نہ کسی طرح کا لباس پہنتے ہیں لیکن ہر قوم کا لباس الگ الگ ہے جس کا تعلق کچھ آب و ہوا سے ہے اور کچھ قومی روایات سے۔ یہی حال زبان کا ہے انسان کا حیوان ناطق ہونا ایک فطری امر ہے، لیکن نوع انسان میں گروہ گروہ کی زبان الگ الگ ہے۔ قرآن کا زاویہ نگاہ دین کے متعلق بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ دین کے کچھ کلیات ہیں جو تمام نوع انسان میں مشترک ہو سکتے ہیں۔ ان کلیات میں ایک عقیدہ توحید ہے، اور دوسرا یہ عقیدہ کہ خلی اور بدی کے اصول بنیادی طور پر یکساں ہیں۔ عقیدہ توحید میں سب سے زیادہ کلیت ہے۔ تمام کائنات اس کی شہادت دیتی ہے۔ جن مذاہب میں توحید کی صورت بہت کچھ مسخ ہو چکی تھی، ان میں بھی رفتہ رفتہ توحید کا عقیدہ خالص ہوتا جاتا ہے۔ ہندوؤں میں بہت سے موجد گروہ اور افراد پیدا ہو سکے ہیں، جیسا نیول میں بھی مسیح کو بعینہ خدا یا خدا کا بیٹا سمجھنے والے کم ہوتے جاتے ہیں۔ تاریخ فلسفہ کا مشہور مؤرخ ہالف ڈنگ لکھتا ہے کہ علوم طبعیہ میں جو کائنات کی وحدت اور آئین کی ہمہ گیری منکشف ہوئی ہے اس سے عقیدہ توحید کو بہت تقویت پہنچی ہے۔ اسلام نے توحید اور اعلیٰ صالحہ کو دین قرار دیا اور ملوثوں کے شمار کو ایک ملوثی جگہ دی اور کہا کہ

اصل مقصد توحید کے راستے سے نیکیوں کی طرف سبقت کرنا ہے۔ یہ دونوں عقیدے ایسے ہیں جو حکمت و عظمت کی بنا پر عالمگیر ہو سکتے ہیں۔

لیکن اگر کوئی دین طریقی عبادت اور متغیر قوانین کو عین دین سمجھے اور اصل و فروع میں فرق نہ کرے وہ دین عالمگیر ہونے کی صلاحیت کو کھو دیتا ہے اور نوع انسان کو متحد کرنے کی بجائے اس میں تفرق انگیزی کرتا ہے۔ ایسے دین میں ظاہر باطن پر اور فروع اصل پر غالب آجاتی ہے۔ اسی لیے لوگ روایت پرست اور قدامت پرست ہو جاتے ہیں۔ وہ بدستے ہوئے حالات میں اپنے تفصیلی آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی قومیں جاہل ہونے کی وجہ سے زندگی کے ارتقا سے الگ ہو جاتی ہیں۔

مسلمان اس وقت جس چیز کو ازلی اور ابدی اسلام سمجھے ہوئے ہیں، اس میں کئی قسم کی چیزوں کی آمیزش ہے۔ اس میں اسلام کے ازلی اصول ہیں اور تغیر پذیر فروع بھی۔ قرآن کریم میں بھی کچھ وسیع اور بنیادی اصول ہیں جو ازلی اور ابدی دین ہیں، اور کچھ وقتی اور جزئی احکام ہیں۔ وقتی اور جزئی احکام میں نزول قرآن کے وقت بھی رد و بدل ہوتا رہا۔ صورت حال کے ساتھ ساتھ حکم میں بھی تبدیلی ہوئی۔ رسول کریمؐ نے اجتہاد بنوئی سے کام لیا، اس کے بعد اسلام کی اصلی روح کے مطابق خلفائے راشدین نے بھی کہیں توسیع کی اور کہیں تخفیف۔ جب تک اسلامی روح زندہ اور ترقی پذیر تھی اسلامی احکام نے کوئی جاہل صورت اختیار نہ کی۔ قرآن کریم میں جو رسکے لیے قطع ید کا حکم تھا لیکن خود رسول کریمؐ اور خلفائے ہر حالت میں جو رسکے ہاتھ نہیں کوڑھتے۔ بعد میں فقہانے اس کے ساتھ بہت سے شرائط وابستہ کیے کہ کس حالت میں چوری، ایسی چوری شمار ہوگی جس پر قطع ید ہو سکتا ہے اور کن حالتوں میں چوری ہونے کے باوجود قطع ید کی حد کا اطلاق نہ ہوگا۔ کئی احکام شرعی منصوصہ اور غیر منصوصہ تھے جن میں علت کے تغیر سے حکم کا اطلاق یا منسوخ ہو گیا، یا معلق کر دیا گیا۔ قرآن کریم کی ہر نص کے عقب میں ایک علت ہوتی ہے اس علت کا جاننا حکمت اور روح اسلام کا عرفان ہے۔ اگر کوئی مسلمان علت کو

جائے غیر نص کے الفاظ کو چھٹ جائے تو وہ خدا پرست ہونے کی بجائے الفاظ پرست ہو جائے گا اور رفتہ رفتہ روح اسلام سے بے گناہ ہو جائے گا۔

حرم جو یاں و رسمے رامی پرستند فقیہاں و فرمے رامی پرستند
برا نکس پر وہ تا معلوم کر دو کہ یاراں و یگوسے رامی پرستند

اس وقت مسلمانوں کے پاس فقہاء اور علماء کی مرتب کردہ فقہ کا ایک دفتر ہے یا ایک موجود ہے اور مسلمان اس دفتر کی پرستش کر رہے ہیں۔ ان کے لیے یہ دفتر لال کتاب بن گیا ہے۔ مائٹوں نے خود زمانے کے حالات کا جائزہ لینا چھوڑ دیا ہے اور ہر مسئلے کا حل اس لال کتاب میں ڈھونڈتے ہیں۔ بیح و مشرا، مالیات اور معاشیات کے تمام مسائل بدل چکے ہیں، اور ان کی ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں جو ہزار برس نہیں بلکہ دو سو برس قبل بھی کسی کے خواب میں نہ آ سکتی تھیں۔ فقہ میں بہت سے اجتہادی قوانین اسلام کے ابتدائی دور سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً کاشتکاری کے متعلق جو کچھ احادیث میں ملتا ہے اس میں بے حد اختلاف ہے۔ لیکن جواز یا عدم جواز کی جو مختلف صورتیں ہیں، جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، وہ حجاز کے حالات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس کے بعد بہت سی فقہ عراق، شام اور مصر کے معاشی اور تمدنی حالات کو مد نظر رکھ کر مدون ہوئی۔ فقہائے کرام میں تفصیلی احکام کے متعلق کثرت سے اختلاف پایا جاتا ہے۔ لیکن خاص گروہوں نے خاص خاص فقہاء کی فقہ کو غیر متبدل شریعت قرار دے کر دین کا اٹل جزو بنا لیا اور اپنے لیے اور آئے دانی نسلوں کے لیے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا۔ رسول کریمؐ نے فرمایا تھا کہ جو قوم جہاد یعنی زندگی کے ہر شعبے میں جدوجہد کرنا چھوڑ دے گی وہ مغلوب اور ذلیل ہو جائے گی۔ یہی بات اجتہاد کے متعلق بھی صحیح ہے۔ اجتہاد کو ترک کر دینے سے بھی قومیں جامد اور لیس ماند ہو جاتی ہیں۔ فقہائے اسلام اور احکام شریعت کی جو تعبیر کی وہ کہیں ضعیف تھی اور کہیں غلط۔ وہ اپنے آپ کو مصون عن الخطا نہیں سمجھتے تھے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ لوگ ان

کے اجتہاد کو مذہب بنالیں۔ جہاں حالات کے لحاظ سے ان کی تعبیر صحیح بھی تھی اور خاص ضرورت کو پورا کرتی تھی، وہاں بھی وہ جوں کی توں اب ہمارے لیے کارآمد نہیں کیونکہ ہماری دنیا ہی بدل گئی ہے۔ ہمارے مسائل کی صورت ہی ایسی ہے کہ ان کا حل کسی ہزار برس قبل کے فقہ کے ہاں نہیں مل سکتا۔

تمام اہم مسائل میں ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں جو اس وقت موجود نہ تھیں اسلامی معاشیات کے کچھ بنیادی اصول ہیں جو قرآن کریم میں ملتے ہیں۔ وہ جزو دین ہیں اور روح اسلام کی ترجمانی کرتے ہیں، لیکن معاشیات کے جو قوانین ہماری فقہ کی قدیم کتابوں میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے اکثر کی اب حاجت ہی نہیں رہی۔ نوٹڈی اور غلاموں کے متعلق تمام فقہ و فتر پارمینہ ہو چکی ہے۔ لیکن ہمارے لکیر کے فقیر ابھی تک اس کو پڑھتے اور پڑھاتے اور اس پر بحث مباحثہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ حفظانِ صحت کے جو قوانین فقہ قدیم میں ملتے ہیں یا جو بعض طبی باتیں اس میں درج ہیں، علوم کی ترقی نے ان میں بہت سی چیزوں کو باطل کر دیا ہے۔ مسلمانوں نے اس مدون فقہ کو شریعت قرار دے کر تغیر و اصلاح کے بالاتر کر دیا ہے۔ اس پورے مجموعے کو وہ غیر متبدل اسلام کہہ کر پیش کرتے ہیں، اور اس کے کسی جزو میں ذرا سی تبدیلی سے بھی انھیں ڈر لگتا ہے۔ گویا یہ دین سے انحراف اور کتاب الہی میں تحریف ہے۔ معاشی، سیاسی اور تمدنی معاملات میں تمام فقہ کی جدید تدوین کی ضرورت ہے۔ پرانی عمارت کو گرا کر اس کا طبع اور سالہ بہت کچھ کام آ سکتا ہے۔ لیکن یہ تعمیر گرا کر از سر نو بنانی پڑے گی۔ اس کی بنیادیں اسلام کے اساسی اصول ہوں گے لیکن اوپر اٹھنے والی تعمیر کا نقشہ پہلے نقشوں سے بہت کچھ مختلف ہو گا۔

ہر پیمانے کے کھنڈ کا باداں کنندہ ادنیٰ آل تعمیر را ویراں کنند

اسلام اسی حالت میں ایک زندہ جاوید اور عالمگیر مذہب رہ سکتا ہے کہ اس میں اصول کو ادا کر کے الگ کر کے دیکھا جائے۔

اسلامی شریعت کی بنیاد حکمت اور عدل پر رکھی گئی ہے اور حکمت و عدل
 اوامر کی لفظی اور ظاہری صورت پر مقدم اور مرجع ہوتے ہیں۔ اگر کسی ملت کا
 قانون ساکن اور مجبور ہو جائے، اور حالات کے تغیر کے ساتھ اس میں تغیر
 ممکن نہ ہے تو ایسی ملت ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائے گی، اور زندہ و ارتقا پذیر
 قومیں اس پر غالب آجائیں گی۔ وہ خود اپنے آئین میں کوئی تغیر نہ کر سکتے گی۔ وجہ
 سے زندہ قوموں سے مغلوب ہو جائے گی۔ مغلوب ہو کر ایسی قوم کو بکھر و اکراہ
 غالب قوم کے آئین کو قبول کرنا پڑے گا۔ ہمارے قوم ہمارے نہ سکے گی۔ اس میں تغیر
 خارج سے پیدا کیا جائے گا۔ وہ حرکت کرے گی لیکن مجبوری اور معذوری کے
 ساتھ۔ چونکہ حرکت خود اس کے اندر سے پیدا نہیں ہوتی اس لیے اس میں کوئی
 عقلی اور روحانی نشو و نما نہ ہوگا، وہ ہر بات میں غالب اقوام کا پس خوردہ
 کھانسنے پر مجبور ہوگی۔ دین ہو یا دین کے ماتحت تشریع اس کا اصل مقصد
 انسانوں کی رہبریت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ قانون نفع و ضرر کی بنا پر بنایا جاتا
 ہے۔ جس میں تجربہ ثابت ہو کہ ضرر زیادہ ہے اور نفع کم، اس کو ممنوع قرار
 دیا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کوئی معائنہ نہیں ہے۔ قرآن خود جب کوئی حکم دیتا
 ہے تو اس کی حکمت اور علت بیان کرتا ہے، اور وہ علت خاص حالات میں
 خاص طریقے سے انسانوں کی نفع رسانی پر مبنی ہوتی ہے۔ دین عدل اور حمت
 ہے اور زندگی میں جائز آسانیاں پیدا کرنے کا نام ہے اللہ بن یس۔ قرآن
 کی تعلیم ہے کہ خدا تمہارے لیے تشکیوں کو دور کرے آسانیاں پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اگر
 دفتر پارمینہ کی ہر تفصیل کو دین سمجھنا شروع کر دیں، اور زبردستی اس کو دیاں لگانا
 شروع کر دیں جہاں اس کا اطلاق نہیں ہوتا اور جہاں اس کی علت موجود نہیں
 تو یہ فعلی عیبت زندگی میں آسانیاں پیدا کرنے کی بجائے اس کے راستے میں
 روڑے اٹھائے گا۔

ایمان کیا ہے؟

انسان کی گونا گوں منطقی، غیر منطقی اور نفسیاتی تعریفیں کی گئی ہیں۔ ایک عام تعریف جو منطق کی کتابوں میں ملتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان حیوانِ ناطق ہے۔ منطق میں گویا فی بھی داخل ہے اور عقل بھی۔ عام طور پر اس کے معنی عقل والا حیوان لیے جاتے ہیں لیکن انسان کی زندگی میں غیر عقلی عناصر اور محرکات اتنے کثیر اور شدید ہیں کہ اب جدید نفسیات اس کو حیوانِ عاقل کہنے سے گریز کرتی ہے، اور یہ تعلیم دے رہی ہے کہ انسان وہ حیوان ہے جو اپنی جسمانی خواہشوں اور غیر شعوری میلانات کو عقل و استدلال کا لباس پہنا کر اپنے افعال کو عاقلانہ ثابت کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ حرکت کوئی اور حیوان نہیں کرتا۔ اس لیے یہ انسان کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انسان کی اور بھی بہت سی امتیازی خصوصیتیں بیان کی گئی ہیں جو اور حیوانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً یہ کہ انسان ہنسنے والا حیوان ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ انسان رونے والا حیوان ہے کیونکہ دوسرا کوئی حیوان نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے۔ انسان کی ایک تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ آگے اور پیچھے دیکھنے والا جانور ہے۔ حاکم انسان کے ماضی کو عالم شعور میں حال بنا دیتا ہے اور اس کے اکثر افکار و افعال کا رخ قریب یا بعید مستقبل کی طرف ہوتا ہے۔ زندگی اپنے

یہ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا آخری مضمون ہے جو انھوں نے وفات سے ایک ہفتہ قبل ثقافت کے لیے لکھا تھا انوس ہے کہ اس کی دوسری قسط مکمل نہ ہو سکی۔ یہ مضمون لکھنے سے قبل انھوں نے کچھ عنوانات قلم بند کیے تھے جن سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس مقالہ میں کیا کچھ لکھنا چاہتے تھے۔ عنوانات کی یہ فہرست مضمون کے آخر میں درج کر دی گئی ہے۔

ادنیٰ مظاہر میں بھی یہاں تک کہ نباتی اور حشراتی دور میں بھی مقصد کو ش ہے۔ لیکن انسانیت کی سطح سے نیچے یہ مقصد غیر شعوری ہوتا ہے جیسا کہ درخت کی شاخیں فوراً تاب آفتاب کی جو یا ہو کر یا بلند ہوتی ہیں یا اپنا رخ بدلتی ہیں۔ جانوروں کی حیرت انگیز انحرافانہ مقصد کو ش بھی زیادہ تر جبلی اور غیر شعوری ہوتی ہے لیکن مستقبل کا کوئی شعوری نقشہ سامنے رکھ کر اس کی طرف کوشش کی باگوں کو موڑنا انسان ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔

انسان کی ایک اور بھی تعریف ہو سکتی ہے۔ جو کہیں میری نظر سے نہیں گزری لیکن میرے ذہن میں اکثر گزری ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان پرستش کرنے والا حیوان ہے۔ کسی اور حیوان میں یہ جبلت دکھائی نہیں دیتی۔ وحشت کے اعلیٰ ترین ادوار سے لے کر تہذیب و تمدن کی حیرت انگیز بلندیوں تک ہم اسے کسی نہ کسی پہنچا یا مخلوق کی پوجا ہی کہتے دیکھتے ہیں۔ وہ کبھی موجود کی پوجا کرتا ہے اور کبھی مومن کو تصور میں موجود بنا کر پوجتا ہے۔ انسان اپنی تمام زندگی میں بیم ورجا کا شکار رہتا ہے۔ کبھی وہ طبعی فطرت کے مظاہر سے خائف ہو کر ان کے شر سے بچنے کی کوشش میں ان کی پوجا کرتا ہے اور کبھی خواہشیں اور امیدیں اس کے لیے معبود تراشتی ہیں۔ اس سے کسی قدر ملتی جلتی انسان کی ایک یہ تعریف بھی ہو سکتی ہے کہ انسان صاحب ایمان ہستی ہے۔ انسان کی یہ تعریف بھی کہیں نظر سے نہیں گزرتی مگر ہم سمجھتے ہیں کہ یہ تعریف بھی اس کی اساسی فطرت کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ یہ خیال کسی قدر وضاحت طلب ہے۔

ایمان کا ایک صحیح اور سادہ مفہوم یہ ہے کہ کسی ایسی حقیقت کو سچ ماننا جو نہ صرف کسی فرد کے انفرادی تجربے سے متجاوز اور اس کے محسوسات سے ماوراء ہو، بلکہ اجتماعی طور پر وہ حقیقت کسی کا حسی تجربہ نہ ہو۔ مختصراً یوں کہیے کہ ایمان کے مفہوم میں لازماً یہ امر داخل ہے کہ ایمان کسی قسم کا بھی ہو وہ ایمان بالغیب ہوتا ہے۔ انسان صرف آگے پیچھے دیکھنے والا حیوان ہی نہیں بلکہ ماورائے تجربہ حقائق کو تسلیم کرنے والا حیوان ہے۔ طرح طرح کے معبود بھی وہ اسی جذبہ ایمانی کی وجہ سے تراشتا ہے اور طرح طرح کے مقاصد

و غایات و نصب العین بھی وہ اسی ایمان کی بدولت بناتا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ محض حاضر سے کبھی مطمئن نہیں ہوتا اور کسی ایسی صورت حال کا آرزو مند رہتا ہے جو ابھی پر وہ غیب اور کتم عدم میں ہے۔ لیکن یہ آرزو اس کو کبھی سہارا نہ دے سکے اگر اس کے متحقق ہونے کا یقین اس کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔ انسان ایسی آرزوؤں کے صورت پذیر ہونے پر بھی ایمان لاتا ہے جن کے پورا ہونے کے لیے کوئی اسباب موجودہ حالت میں دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن انسانی ارتقا کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ اسباب ایمان پر مقدم نہ تھے بلکہ ایمان کے استقلال اور اس کی استواری نے اسباب نہیا کر دیے۔ اس لحاظ سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایمان ایک حقیقی قوت ہے۔ ہم نے انسان ہی کو صاحب ایمان ہستی کہا ہے لیکن اگر یہ نظر غائر دیکھا جائے تو یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ حیوانی زندگی میں بھی ادنیٰ اسے اعلیٰ کی طرف ارتقا ایمان ہی کی بدولت ہوا ہے۔ زندگی کبھی مادہی اسباب و آلات سے پابزنجیر اور میکاکی علت و معلول کے زنداں میں اسیر نہیں رہی۔ حیاتیات میں جن حکمانے ارتقا کا نظریہ پیش کیا ہے ان میں سے بعض اس کے قائل ہیں کہ حشرات و پرند و پرند میں بھی ارتقا حیات نے جو انقلابی قدم اٹھائے ہیں ان کی وجہ بعض خارجی اسباب کا جمع ہونا یا ماحول کی فیاضی نہ تھی بلکہ اس امر پر غیر شعوری ایمان تھا کہ بلند تر زندگی ممکن الوجود ہے۔ اسلامی تاریخ میں ارتقا کے حیات کے مبلغوں میں سب سے بڑھ کر عارف و عارف ہیں۔ جنہوں نے وضاحت کے ساتھ یہ نظریہ پیش کیا کہ زندگی کسی مرحلے میں بھی قالب کی پیداوار نہیں ہوتی بلکہ روح حیات خود قالب آفریں ہے۔

قالب ازماہست شد نے ما اندو

بلند اور بہتر زندگی پر ایمان جانوں میں قوتِ خلاق پیدا کرتا اور آرزو کے مستور کو سطحِ ظہور پر لاتا ہے۔ مادے سے انسان تک جو قوت زندگی کو اوپر اُبھارتی چلی آئی ہے وہ عشق کہتے ہیں۔ یہی عشق وجدان حیات بھی ہے اور ایمان حیات بھی۔ مادے کو حیاتِ نباتی کا کچھ تجربہ نہ تھا لیکن اس کا جذبہ ارتقا ایمانِ آخرین تھا کہ بلند تر ہستی

سے رابطہ پیدا کر کے میں وہ کچھ ہو سکتا ہوں جو ابھی میرے دہم و گمان میں نہیں آتا، لیکن ایسا ہونا یقینی ہے۔ مولانا روم نروبان حیات پر پایہ بہ پایہ چڑھتی ہوئی زندگی کو دیکھتے ہوئے یہ ایمان رکھتے ہیں کہ

آنچه اندر دہم نامد آں شوم

جس ہستی نے بھی حیاتِ حاضرہ کو اپنی منزل سمجھ لیا اور آئندہ کے ناقابلِ بیان ملکات کو موجود بنانے پر یقین نہ کیا ایمان کی کمزوری کی وجہ سے اس کی ترقی رک گئی۔ عارفِ رومی نے کئی مرتبہ اس یقین کو ذہن نشین کرنے کی کوشش کی ہے کہ موجودہ انسان بھی ایک عبوری مخلوق ہے یا حیوانیت اور فوق الانسان کی طرف عبور کرنے کے لیے ایک پل ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ ہمیں تو یہ فوق الانسان نہ کہیں نظر آتا ہے اور نہ اس کا کوئی تصور ہمارے ذہن میں آ سکتا ہے تو اس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ موجودہ انسانی زندگی میں جو صورتِ حیات ابھی متحقق نہیں مجھے اس کی آرزو ہے اور اس کے متحقق ہونے پر ایمان رکھتا ہوں:

دہی شیخ با چراغِ ہمی گشت گرد شہر
کز دام و دودِ علوم و انعام آرزوست
ایں ہرمانِ بخت عناصرِ دلم گرفت
شیرِ خدا و رستمِ یزدانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جبہ ایم
گفت آنکی یافت می نشود انعام آرزوست

مولانا نے کئی جگہ اس کی تشریح کی ہے کہ زندگی کی وسیع تر اور بلند تر سطح کا کوئی واضح تصور اس بلند تر سطح پر پہنچنے کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال عارفِ رومی نے یہ دی ہے کہ رجم کے اندر اگر جنین محض اپنے موجودہ تجربہ حیات سے استدلال کرے تو اس کے لیے اس حقیقت کا قائل ہونا محال ہو کہ شکمِ مادر سے باہر ایک عظیم الشان عالم اور لامحدود و گونا گونی کی دنیا ہے جس کے مقابلے میں میں موجودہ حالت میں ایک تنگ و تاریک زنداں میں مقید ہوں۔ نو مہینے اسی زنداں میں بسر کر چکنے کے بعد وہ کسی تجربے اور استدلال کی بدولت باہر نہیں آتا بلکہ زندگی کی دستِ کوشی کا ایک ایمانِ مضمر اس کو وسیع تر عالم میں سے آتا ہے جہاں پہنچ کر

تجربہ اسی خیر شعوری ایمان کی تصدیق کرتا ہے۔ اس سے مولانا یہ استدلال کرتے ہیں کہ یہ زمان و مکان کا عالم، یہ عالم رنگ و بو، یہ جہاں آب و گل اپنی وسعتوں اور رنگینیوں اور دلاویزیوں کے باوجود ایک رحم ہے جس کے اندر انسانی جانیں پرورش پاتی ہیں۔ لیکن یہ گھرنے کا مقام نہیں، سرسے سر راہ گزار ہے، منزل مقصود نہیں۔ محض استدلالی سے اس سے بالاتر عالم کا نہ ثبوت مل سکتا ہے اور نہ کوئی تصور حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن انسانی روح کے اندر یہ ایمان مضمر ہے کہ حیات لامتناہی کو نہ زمان و مکان مقید کر سکتے ہیں اور نہ مظاہر کی علت و معلول کی زنجیریں۔ زمان و مکان کی ماہیت پر غور کرنے والا نفس خود اس زنداں میں محبوس نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا ہے کہ اے معشر جن و انس تم ان حدود و قیود سے باہر نہیں نکل سکتے۔

یَعِشُ الْجَنُّ وَالْإِنْسُ أَنْ اسْتَطَعْتُمْ
ان تَمُوتُوا مِنْ أَمْنٍ أَوْ قِتَارٍ أَلَسَمْتُمْ
وَالْأَرْضُ فَالْقُدْ وَالْأَمْتَقْدُونِ
الْأَسْلَافِ

یعنی کروہ جن و انس اگر تم میں یہ سکت ہے کہ
تم آسمانوں اور زمین کے حدود سے باہر نکل جاؤ
تو یہ کوشش بھی کرو کیجو۔ تم کسی سلطان کے
بغیر باہر جا ہی نہیں سکتے۔

یہ قوت یہ سلطان قید شکن وہی چیز ہے جسے ایمان کہتے ہیں۔ اسی سلطان ایمان کی بدولت قیود و جہاد می سے نکل کر حیاتِ نباتی میں داخل ہوتی ہے جہاں گل تبدیل بہ گل ہوتی ہے۔ مٹی محض اپنی جمادی قوت سے کبھی گل نہ بن سکتی اگر مٹی محض مادی اسباب کے مہیا کرنے میں لگی رہتی اور اس کے اندر ممکن کو موجود کرنے کا ایمان اور میلان نہ ہوتا تو ابد الابد تک جماد جماد ہی رہتا۔ اس جمود سے نکلنے والی قوت مٹی کا وہ ایمان ہے جس نے فقط موجودہ اسباب پر قناعت نہیں کی بلکہ بلند تر زندگی کے لیے اسباب و آلات و حالات پیدا کیے۔ اس نظریہ حیات کے وہ حکما بھی قائل ہیں جنہوں نے زمانہ حال میں انیسویں صدی کی گمراہ کن مادیات اور میکائینت کی تردید کر کے روح انسانی کے لیے آزادی کی راہیں کھولیں۔ اتفاقی طور پر وظائف اعضا کی تبدیلیوں

سے جگنو نے اپنا چراغ نہیں جلایا بلکہ تاریکی شب میں راستہ ڈھونڈنے کی تمنا کی شدت نے یہ برقی بیٹری کر ملک بے مایہ کے اندر پیدا کر دی۔ سمندر کی تاریکیوں میں بھی کئی مچھلیاں خود اپنے نور کی روشنی میں اپنی زندگی کا کاروبار کرتی ہیں۔ علامہ اقبال انسان کو خود داری کی تعلیم دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

تاکجا طور پہ در یوزہ گرمی مثلِ کلیم
اپنی مٹی سے حیاں شعلہ سیدنائی کر

یہ کام وہی ہے جو جن کے جگنو اور سمندر کی بعض مچھلیاں انسان سے بہت پہلے کر چکی ہیں۔ اہل اس اشرف المخلوقات کے لیے سبق آموز ہیں۔ اس خیال کو کہ زندگی حالات اور آلات کی محتاج نہیں بلکہ خود ان کی آفرینش کرتی ہے حکیم امت نے کس عمدگی سے اس شعر میں ادا کیا ہے:

کلب پا از شوخی رفتار یافت
بیل از ذوق نوا منقار یافت

بیل کی منقار اور اس کے گلے کے سارے نغمہ آفرینی نہیں کی بلکہ شدتِ ذوقِ سرور نے یہ ساز مہیا کر دیا ہے۔ چکور کو ذوقِ رقص نے موزوں قسم کے پاؤں عطا کیے ہیں یہ نہیں ہے کہ پاؤں کی خاص ساخت کی وجہ سے وہ رقص کرنے لگا ہے۔ اس بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کی قوت ہی زندگی کی تخلیقی قوت ہے۔ جمادات سے لے کر انسان تک اس کا ایک ہی قانون ہے اگرچہ اس قانون کے اطلاق میں تنوع اور مسلسل بڑھتی ہوئی وسعتیں اور بلندیوں پائی جاتی ہیں۔

ایمان کی اہمیت ہی میں یہ بات داخل ہے کہ وہ اس حقیقت کا ایقان ہے جو عالم شہادت کے مقابلے میں ابھی تک عالم غیب میں ہے۔ اس کی ضد کفر ہے جس کا مفہوم عالم غیب کا انکار ہے۔ قرآن کریم میں آدم و ابلیس کا قصہ درحقیقت ایمان و کفر کی تفریق کی وضاحت ہے۔ خدا نے آدم کو مٹی سے بنایا۔ ابتدا سے آج تک جتنے انسان ہیں وہ سب مٹی ہی کے بنے ہوئے ہیں۔ گوشت، پوست، ہڈی، خون سب مٹی ہی کے عناصر کی مختلف صورتیں ہیں۔ تمام غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ مٹی نبات بنتی ہے اور نبات کو حیوانات بدن کے اجزاء میں تبدیل کر سکتے ہیں انسان

جب سبزی کھاتا ہے یا گوشت کھاتا ہے تو یوں سمجھنا چاہیے کہ یہ خاک کا پتلا خاک ہی کھارہا ہے۔ اس مٹی کے بت کے اندر خلاقِ فطرت نے اپنی روح حیات پھونک دی نعمتِ فیہ من دوحی جس کی بدولت لامتناہی زندگی کے ممکنات اور لامحدود قوتیں اس کے اندر مضمر ہو گئیں، جس طرح کہ ایک شہر اور درخت اپنے چھوٹے سے بیج میں مضمر ہوتا ہے۔ ملائکہ ملکات حیات کی مختلف صورتوں کا نام ہے۔ ملک اور ملک کا لغظی مادہ ایک ہی ہے۔ عارفِ رومی نے اپنے ملفوظات ”فیہ مافیہ“ میں ملائکہ کو اس عقلِ کل کی متنوع صورتیں قرار دیا ہے جن کی بدولت حیات و کائنات کا نظم و نسق قائم ہے۔ اس کی مثال انھوں نے یہ دی ہے کہ موم سے کئی طرح کے پرند بنا سکتے ہیں لیکن اگر ان سب کو پگھلا دیا جائے تو محض موم کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا کیونکہ ان کی صورتیں محض اعراض تھیں جن کا جوہر فقط موم تھا۔ قصہٴ آدم میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ ملائکہ کو حکم ہوا کہ تم اس نو آفریدہ مخلوق کے آگے سر تسلیم خم کرو۔ خدا کے مطیع تو تم ہو ہی لیکن اب حکیم خدا اس کی بھی اطاعت کرو جس میں روح الہی پھونکی گئی ہے۔ اس مخلوق کی تقدیر یہ ہے کہ وہ اس عالمِ ارضی میں نائبِ حق ہو۔ نائبِ حق کی اطاعت حق کی اطاعت کے متافی نہیں بلکہ حکیم حق لازم ہے۔ آدم کو ذی اختیار ہستی بنانے کا ایک ناگزیر نتیجہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اس اختیار کا غلط استعمال کرے اور اسے تعمیرِ حیات کی بجائے تخریب میں صرف کرنے لگے۔ ملائکہ یا فطرت کی قوتوں کو انسان کا یہ پہلو دکھائی دیا کہ یہ فساد پیدا کرے گا اور خونِ ریزی کرے گا اور اس حالت میں بندہٴ فرمان بردار نہ ہو گا۔ انسان کی فطرت کا یہ پہلو بھی ایک حقیقت ہے اس لیے ملائکہ کو جو کچھ اس کے اندر نظر آیا وہ بھی صحیح تھا مگر غلطی اس کے اندر یہ تھی کہ

عیبِ او جملہ بلغتی ہنر شش نیز کو

آدم کے علم و ہنر کے پہلو فطرتِ مجبور کی نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ آفرینشِ آدم کے بلیغ اشعار میں علامہ اقبال نے اس خیال کو مؤثر انداز میں بیان کیا ہے:

فطرتِ آشفقت کہ از خاکِ جہان مجبور خود گرے خود شکنے خود نگرے پیداشد

ورودِ آدم سے قبل کائنات میں کوئی ایسی ہستی نہ تھی جسے اپنے آپ کو بنانے اور بگاڑنے کا اختیار ہو۔ بالفاظِ دیگر وہ ایک حد تک اپنی تقدیر کی معمار ہو۔ کسی مخلوق میں اپنی ذات کا شعور بھی نہ تھا۔ سب ضرورت شعور ماحول جانداروں میں پایا جاتا تھا لیکن اس سے آگے نہ شعور ذات تھا اور نہ شعور حق۔ ابتدائی آشفستگی کے بعد فطرت کی قوتوں نے اطاعتِ آدم اس لیے قبول کر لی کہ علمِ اشیا و حوادث کی بدولت اس کا مسخر کائنات ہونا ان پر آشکار ہو گیا۔ تسخیرِ فطرت انسان کا مخصوص وظیفہ حیات اور درجہِ مکرمِ آدم ہے۔

فطرت کی قوتیں اس کی عظمت پر ایمان سے آئیں لیکن ابلیس کا فر ہو گیا۔ اس کفر کی ماہیت بھی قرآن کے قصہِ آدم سے آشکار ہوتی ہے۔ اس قصے میں ابلیس اس مادیت کا نمائندہ ہے جس کو مادے کی ترکیبات کے اندر مادی عناصر سے زیادہ کوئی مستقل جوہر حیات نظر نہیں آتا۔ قرآن کا ابلیس منطابِ پرست ہے۔ اس نے آدم کو فقط اسی نظر سے دیکھا کہ وہ محض مٹی کا ایک پتلا ہے۔ اس بے حقیقت مخلوق کو مسجدِ ملائک ہونے کا حق کہاں سے حاصل ہو گیا۔ آج بھی جو حکیم طبیعی مادیت اور میکانیت کے باطل فلسفے کا شکار ہے وہ انسان کو عناصرِ ارضی کا ایک اتفاقی مجموعہ و مرکب سمجھتا ہے۔ وہ اس کے اندر حیاتِ حیوانی کے علاوہ کسی ایسی روح کا قائل نہیں جو مادی قوتوں کی پیداوار نہیں بلکہ علم و عمل کی بدولت مسخر اور نفوذِ الہی کی بدولت لامتناہی قوتوں کی حامل ہے۔ وہ روح کی آواز کو جسم کے ساز کی آواز سمجھتا ہے۔ جو ساز کے ٹوٹنے پر خاموش ہو جائے گی۔ یا چراغِ بدن کے تیل کی عارضی روشنی ہے جو چراغ کے ٹوٹنے یا تیل کے ختم ہونے پر ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی۔ گویا بندرہ کی ایک ترقی یافتہ نوع ہے جس نے بندروں سے زیادہ ذہین ہو کر بڑھتی ہوئی ضروریات کے لیے آلات بنالیے ہیں۔ مادہ پرست کو اس کے اندر کوئی ابدی قرار حیات نظر نہیں آتی۔ اکبر الہ آبادی نے باندازِ ظرافت کیا حکیمانہ بات

کہی ہے:

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈاروں بوسے بوز نہ ہوں میں
سن کہنے کہنے لگے مرے اک دوست فکر ہر کس بقدر محبت دوست

قرآن نے مظاہر پرستی اور مادہ پرستی ہی کو باندھا ابلیس پیش کیا ہے جس کو تکریم آدم کے وجوہ نظر نہیں آسکتے۔ اس کا استدلال مادہ پرستی کے اندر مضمور ہے اس لیے کہ آدم بس خاک کا پتلا ہے۔ آدم کا مرنی منظر یقیناً خاکی تھا۔ اس کے لامتناہی ممکنات پر یقین ایمان کا متقاضی تھا جو ابلیس میں پیدا نہ ہو سکا۔ اس کے معلومات سب اور اکائیت حاضر کی بدولت تھے۔ حاضر سے غیب کی حقیقتوں کی طرف عبور کرنے کی صلاحیت اس میں نہ تھی۔ جس کو مختصراً یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایمان سے عاری تھا۔ ابلیس ایک تمثیل ہے اس مضمور و محدود و نظر و اسے انسان کی جو زندگی کی لامتناہی سرسیت اور اس کی لامحدود ارتقائی قوتوں کا قائل نہیں۔ مادہ پرستی حاضر پرستی ہے وہ اس امر کا انکار ہے کہ ہر حالت میں غیب حاضر کے مقابلے میں وسیع تر ہے۔ مزید برآں النفس و آفاق دونوں میں غیب حاضر کے مقابلے میں کشف حقیقت بھی ہے اور بوسلہ ایمان حقائق حیات بھی۔

قصہ ابلیس و آدم میں اور بھی نہایت اہم اسرار حیات پنہاں ہیں۔ فقط مادیت کا قائل اور مظاہر پرست ان تمام حقائق کی نسبت مائل بہ انکار ہوتا ہے جو اس کے اور اک حسی کے محدود سانچوں میں نہ داخل ہو سکیں۔ طبیعی باتیں کی ترقی نے حیات و کائنات کا جو غلط نظریہ وضع کر دیا وہ خود انسان کے نفسی حقائق کا بھی منکر ہو گیا۔ کیونکہ نفس کی کوئی مستقل حقیقت مادہ پرستی کی علت و معلول کی کڑیوں میں کہیں نظر نہ آتی تھی۔ مادیت کا مدار ریاضیات پر تھا۔ ان نظریے کے مطابق ہر شے کی حقیقت ریاضیاتی تناسب کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جس چیز پر ریاضی کا اطلاق نہ ہو سکے وہ محض فہم کی پیداوار ہے۔ مادیت کی

بنیاد پر جو نفسیات لکھی گئی اس نے روح یا نفس کو خارج از بحث کر دیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود وہ شعور بھی بے حقیقت ہو گیا جس نے یہ نظریہ حقیقت پیدا کیا تھا گویا اس خیالی باطل کی بنیاد پر انسان خود اپنا منکر ہو گیا۔ مادی مظاہر کے تسلسل کا اقرار باقی رہ گیا اور اس کے علاوہ تمام حقائق حیات کے متعلق انکار ہی انکار اس انکار منشی سے ایک بھوٹا پنہار پیدا ہوا۔ مادہ پرستی میں عالم کل ہو سنے کے زعم نے ترقی پذیر معرفت کے دروازے بند کر دیے۔ قرآن کریم کے ابلیسیوں اسی لیے آپ کو انکار اور پنہار نظر آتا ہے۔ حقائق نامشہود کا انکار انسان کے نفس کو محدود کر دیتا ہے۔ معرفت حیات کے لیے لازمی ہے کہ انسان حقیقت حیات کی لا محدودیت کا احساس رکھے۔ جو کچھ اب تک معلوم ہوا ہے اس کو نامعلوم کے مقابلے میں نہایت قلیل سمجھے۔ اور سب زرد فی علمایا کی مسلسل دعا اس کا وظیفہ بن جائے۔ علم کے ساتھ علم اسی زاویہ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے اغلاطوں نے کہا کہ علم کی ابتدا حیرت سے ہوتی ہے۔ حیرت انسان کے اندر استغمام پیدا کرتی ہے اور پیدا شدہ سوال کے جواب کے لیے نفس انسانی تجسس، مشاہدے اور استدلال سے کام لیتا ہے۔ زندگی کی نسبت جس شخص کے اندر حیرت پیدا نہیں ہوتی اس کے اندر حکمت کا آغاز بھی نہیں ہوا۔ حکمت یونانی نے حیرت کی بدولت علم میں ترقی نہ کے بہت سے قدم اٹھائے۔ لیکن وہ علم میں اس فراوانی پر نہ پہنچے جو انسان کو پھر ایک نئی حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ اس نئی حیرت ہی سے نئی معرفت کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ لاقتناہی ہے۔ عرفی نے اس مصنمون کو نہایت بلیغ انداز میں ادا کیا ہے سو، کہتا ہے کہ عوام جن باتوں کو معلوم اور واضح سمجھتے ہیں، گویا ان کو جاننے میں کوئی اشکال ہی نہیں ان کے پردے میں پراسرار حقائق ہیں جن کا اندازہ چشم بصیرت یا عارفانہ حیرت ہی کر سکتی ہے،

ہر کس نہ شناسندہ راز است و گرنہ این ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

اسی مضمون کو مرزا غالب نے اپنے انداز میں پیش کیا ہے،

واقف نہیں ہیں تو ہی نوا پاسے رات کا
یاں ورنہ جو جواب ہے پروہ ہے ساز کا
پیر عارفانہ حیرت "ایمان بالغیب" کبھی بغیر پیدا نہیں ہو سکتی۔ احساس سریت حیا،
احساس وسعت عالم غیب کا نام ہے۔ ہمارے ہاں حکیمانہ مزاج کے حدود پاسے گیار
نے عارفانہ حیرت ہی کو علم کا انجام قرار دیا ہے۔ عارفِ رومی کہتے ہیں،

علم را بجز روش و حیرانی بجز

کیونکہ محض علم سے پندار پیدا ہوتا ہے اور حیرت سے نظر میں وسعت و اعجاز ہوتا
ہے۔ عطار کا یہ قطعہ بھی نہایت درجہ عارفانہ اور حکیمانہ ہے:

کارے گفت است می باید بے عقل و حکمت، تا شود گویا کئے

باز باید عقل بے حد و شمار تا شود خاموش یک حکمت شعار

مگر یہ خاموشی پھر آہستہ حقائق ہو جاتی ہے اور اس سے ایک نئی سطح کی گویائی نمودار
ہوتی ہے جس کے اندر عجز بھی ہوتا ہے اور اقرار بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انکار و
پندار ناپید ہو جاتے ہیں اور "ایمان بالغیب" سے معرفت میں مسلسل اضافہ ہوتا
رہتا ہے۔ کسی انسان کے اندر یہ خیالی کہ میں عرفانِ حقیقت کے منتظر رہتا ہوں
اس پر مزید ترقی کے راستے بند کر دیتا ہے اسی لیے عارفِ رومی یہ ہدایت فرماتے
ہیں کہ ہستی لاقتنا ہی ہے کسی ایک مقام کو آخری منزل سمجھ کر اس پر ڈیرہ نہ ڈال
دیجنا:

اسے مراد ہے نہایت درگست ہر چہ ہر جسے می رسی برو سے مالیت

معرفتِ کوش انسان میں کبھی انکار، پندار اور متکبار پیدا نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے انہیں
صفائیتِ حیات کش کو ابلیسییت قرار دیا ہے۔ روحیت اور الوہیت کو حیات و
کائنات کی اساس سمجھنے والا ایک قسم کی لا اوریت کے باوجود معرفت میں ترقی کرتا
رہتا ہے۔ عقلی و ادراکی اور انسانی تجربات سے حاصل شدہ معلومات کو وہ کبھی
حقیقت نہ مانتی گا مراد غائب نہیں سمجھتا۔ ایک عظیم الشان نبی بھی جس پر معرفت کے کئی

دروازے کھولے گئے وہ بھی علی الاعلان اقرار کرتا ہے کہ ہمارے فحاشی معرقت علم ہستی ہی کا ہوتا ہے۔ اگر ہستی لامتناہی ہے اور اس میں مسلسل اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے تو اس سے یہ نتیجہ لازم آتا ہے کہ انسان کا علم کسی ایک منزل پر بھی پوری ہستی پر حاوی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کریم نے ایک طرف ہستی کے لامحدود ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے اور دوسری طرف علم کے محدود ہونے کا احساس بھی انسان کو دلایا ہے۔ کلمات الہی جن سے آفرینش و بقائے حیات و کائنات ہے ان کے لامحدود ہونے کی نسبت فرمایا گیا کہ اگر تمام سمندر لکھنے کی روشنائی بن جائیں اور تمام جہان کے درختوں سے قلم بنائے جائیں تو بھی ان کلمات کی مکمل فرست نہ بن سکے:

ولو ان ما فی الارض من شجرة
اقلام و البحر یمد کلام
سبعة اجار ما لقد کلمت
الله۔ (۲۴: ۳۱)

اور اگر زمین کے سارے درخت قلم بن جائیں
اور سمندر بلکہ اس کے علاوہ سات سمندر اور
بھی سیاہی بن جائیں تب بھی "کلمات اللہ"
ختم نہ ہوں گے۔

اور علم کی نسبت فرمایا کہ:

وما اوتینم من العلم الا قلیلاً

نہذا اپنے فیض سے غیب کے حقائق حسب سعی و توفیق اور حسب ضرورت اپنے خاص بندوں پر منکشف کرتا رہتا ہے لیکن یہ انکشاف بھی جزئی ہوتا ہے اس لیے کوئی عارف باللہ یا نبی محترم مطلقاً عالم الغیب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ بہت کچھ جو خواص کے لیے غیب ہوتا ہے خواص کے لیے شہود اور تجربہ بن جاتا ہے لیکن خواص کے آگے ہمیشہ بہت کچھ غیب باقی رہتا ہے اس لیے ایمان بالغیب کی ضرورت و پالی بھی ہے۔

مادیت پرست اور مظاہر پرست جبری بھی ہوتا ہے اس کو طبیعی مظاہر میں ہر جگہ جبری جبر دکھائی دیتا ہے۔ مادی مظاہر کی فطرت، فطرت مجبور ہے۔ مادی

اپنے مداروں میں ریاضیاتی جبر کے ماتحت گردش کرتے ہیں۔ ہوائیں اپنی مرضی سے
 اپنا رخ نہیں بدل سکتیں۔ پانی اپنی مرضی سے نشیب کی بجائے فراز کی طرف نہیں بہ
 سکتا۔ مادّی مظاہر کی تقدیر متعین اور اٹل ہے۔ عقل مظاہر فطرت سے قوانین
 اخذ کرتی ہے وہ بھی اس جبری فطرت کی آئینہ دار ہے اسی لیے از روئے عقل اگر
 اختیار کو ثابت کرنا چاہیں تو یہ کوشش کبھی بار آور نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ عقل کا وظیفہ
 ہی یہی ہے کہ وہ ایک طرف مظاہر فطرت میں اور دوسری طرف استدلال میں لزوم
 کی کڑیاں تلاش کرے۔ جن لوگوں نے دین کے اندر بھی محض عقل استدلالی سے
 کام لیا ہے وہ خدا کے عطا کردہ اختیار انسانی کو ثابت نہیں کر سکے اور ہمیشہ کسی نہ
 کسی رنگ میں جبری پر پہنچے ہیں۔ چنانچہ متکلمین میں اشاعرہ اسی لیے جبری ہو گئے۔
 انھوں نے عقیدہ کسب کے پردے میں جبر کو چھپانا چاہا مگر جبر چھپ نہ سکا۔
 صحیح عقیدہ وہی مسلمہ اسلامی عقیدہ تھا کہ الا یمان بین الجبر والاختیار
 انسان طبعی فطرت سے مطلقاً الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس کے باہر اور
 اس کے اندر بھی جبر کے بہت سے مظاہر موجود ہیں لیکن انسان کی اختیاری شخصیت
 خدا کا عطا کردہ اختیار ہے جو طبعی فطرت کی علت و معلول کی کڑیوں سے الگ
 چیز ہے۔ یہ احساس اختیار انسان کے وجدان حیات میں داخل ہے۔ اگر مظاہر
 فطرت اور مظاہر شناس حکمت طبعی اس کے اقرار کے لیے دلائل دیا نہیں کر سکتے
 تو اس سے اختیار باطل نہیں ہو جاتا کیونکہ زندگی مظاہر فطرت اور منطق سے
 وسیع تر اور عمیق تر ہے۔ زندگی کا یہی باطنی وجدان فطرت اور عقل مظاہر شناس
 کے سقائے میں عالم غیب میں ہے۔ جو کچھ عالم شہود میں آجائے گا وہ جبر اور
 منطق و ریاضیات کی کڑیوں میں پرویا جاسکے گا۔ اسی وجہ سے مادّیت و اس کے
 تمام فلاسفہ جبری ہیں مگر افسوس ناک بات یہ ہے کہ بعض منطق بگھارنے والے
 حامیان دین بھی جبری کی تعلیم دیتے چلے آئے ہیں۔ علم الکلام کے علاوہ اس
 تعلیم کا اثر ہمارے بچے کے تصوف پر بھی پڑا اور تصوف کے راستے سے

ہجاری شاعری میں بھی و جلی ہو گیا:

نامی ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مٹا دی کی

(سیر)

جو ہا ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عیث بد نام کیا

جہانہ عمر و آل پر سوار بیٹھے ہیں

(آزاد)

سوار خاک ہیں سبے اختیار بیٹھے ہیں

فارسی متصوفانہ شاعری بھی اس خیالی باطل سے لبریز ہے۔ اسلامی تعلیم اور

شاعری میں اس کے خلاف شدید جہاد پہلے عارفِ روحی نے اپنی مثنوی میں کیا اور

زمانہ حال میں علامہ اقبال نے بھی نہایت زور سے جبر کے خلاف احتجاج کیا۔ قصہ

ابلیس و آدم ہیں ہم دیکھتے ہیں کہ آدم نے تو اپنی لغزش کا اقرار کیا کہ میں معافی کا

خواستگار ہوں میں نے اپنے اختیار کو غلط برتنا۔ لیکن ماؤ بیت اور اس سے وابستہ

عقیدت کے منظر ابلیس نے خلاف ورزی حکم الہی کا الزام خود غدا پر دھرا اور کہا کہ

اگر میں گمراہ ہوا ہوں تو قادر مطلق ہونے کی وجہ سے تو نے ہی مجھے گمراہ کیا۔ آدم اختیار

کا اقرار کرتے ہوئے معافی مانگتا ہے لیکن ابلیس اپنی ماؤ بیت کی وجہ سے جبر کی پناہ

لیتا ہے۔

فہرست عنوانات

ایمان یقین ہے دلیل کا نام ہے۔

ہر ایمان، ایمان بالغیب ہے۔ جو کچھ الٰہی تجربے میں یا معرض شہود میں نہیں آیا

اس کی حقیقت کا یقین۔ امید کا طبعی بیان جو انسان میں موجود ہے اس کا نام

ایمان ہے۔ دنیا بہ امید قائم عام محاورہ ہے اور ایمان آخرت بہ امید قائم۔

معتنٰی مکتناست کی نسبت اشتغال صحیف یا اشتغال قوی ہو سکتا ہے مگر اس کو ظنی

خدا ہے کہ یقین ہے ایمان نہیں کہہ سکتے۔

معتنٰی نقل یا مستند کی بنا پر کچھ یقین کہہ سکتے ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

بھی محض دوسرے انبیاء کو سند قرار دے کہ ایمان سے عمل نہیں کیا۔ بعض اکابر انبیاء کی تعلیم — وہ قبل وحی قرآن بھی آگاہ تھے۔ مگر اس دور کی نسبت قرآن کہتا ہے کہ تم کو یہ تک معلوم نہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔

جب کسی مذہب کی بنا پر محض نقل و سند کے سوا کچھ نہیں رہتی تو وہ مذہب کمزور اور بے اثر ہو جاتا ہے۔ روحانیات میں تقلید کو مولانا روم نے بہت بُرا عمل قرار دیا ہے۔

ایمان اور عشق کا باہمی واسطہ: عشق کے اندر جو شدید تمنا ہے کیا وہ ایمان آفرین ہوتی ہے؟

زمان و مکان میں محدود حاضر کو کل حقیقت سمجھ کر اس پر فتویٰ نہ لگانا بلکہ اس کو ایک وسیع تر کل کا جزو سمجھ کر کوئی رائے قائم کرنا۔

عقل و ادواء اور جذبات، نفس انسانی کے تینوں عناصر ایمان میں یکجا پائے جاتے ہیں۔ ایمان کا تعلق انسانی تجربے سے ہے۔

صبر ایمان کا لازمی جزو ہے۔ تو اعدوا بالحق و تو اعدوا بالصبر۔

ایمان عقل کا پر پرواز ہے۔ عقل محسوسات و معقولات سے رشتہ بہ پایا بہ زنجیر زمین پھائی کرتی اور دھیرے دھیرے بھونک بھونک کر قدم رکھتی ہے

ایمان پر عمل کرنے کے لیے عقل درکار ہے۔ لیکن عقل کی قوتیں بغیر ایمان کے نہ محرک عمل ہو سکتی ہیں اور نہ جذبہ آفریں۔ اعدوا ثابت و قدس عہا فی السماء

ایمان انبیائے عظام و اولیائے کرام میں حبلی اور دھیری ہوتا ہے یا شدید تلاش حق اور کارزار نفس کے بعد یہ فیضانِ عطا عمل ہوتا ہے۔

تاریخ انسانی میں تمام بڑے کارنامے کسی نہ کسی قسم کے ایمان کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔ ایمان کی قوت ہی نے ناپید کو پیدا اور مستور کو ظہور بخشا ہے۔

ایمان زندگی کی حقیقی قوتوں کا نام ہے۔ تخلیقِ کونیا کسی کی بدولت ہے اور ربنا کا جتنا حق بھی ہے۔

کسی چیز پر جتنا ایمان ہوتا ہے اسی نسبت سے انسان اس کے حصول و بقا میں قوتیں صرف کرتا ہے۔ اگر کسی معاملے میں انسان کا عمل مذہب اور بودا ہے تو یہ قطعی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس کی تہ میں جو ایمان ہے وہ استوار نہیں انسان زندگی کا راستہ ظاہری آنکھوں سے نہیں بلکہ ایمان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اگر ایمان غلط ہے تو انسان غلط راہوں پر گامزن ہو کر غلط حقیقی کو کھو بیٹھے گا۔

غلط ایمان کے ساتھ صراط مستقیم پر چلنا محال ہے۔ ایمان ایک مرتبہ حاصل ہو کر خود بخود قائم رہ سکتا ہے یا جسم کی طرح اس کو بھی اپنی بقا کے لیے مسلسل غذا کی ضرورت ہے؟ عمل کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ اگر ایمان درست ہے تو عمل کے نتائج اس کو تقویت بخشتے ہیں اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں ایمان سے عمل اور عمل سے ایمان پیدا ہوتا ہے۔

مہاسب حیات کے محلوں میں ایمان ڈھال کا کام دیتا ہے۔ (حدیث) یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا ایمان اس کی زندگی کے تمام شعبوں میں جاری و ساری اور اس کے تمام محسوسات و تجربات پر حاوی ہو لیکن نہ اس کی کوئی منطقی توجہ ہو سکے اور نہ کوئی واضح بیان۔

یہ ہو سکتا ہے کہ مختلف افراد اور ملتیں اپنے ایمان کو مختلف انداز میں بیان کریں لیکن بنیادی حقیقت سب میں مشترک ہو۔

ایمان جبر سے پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے ایمان کے بارے میں جبر حرام ہے خواہ وہ جبر خفی ہو یا جلی۔ یہ ایمان کی خامی ہے کہ اس کے لیے جبر کو روا رکھا جائے۔ صحیح ایمان کا غوری انعام یہ ہے کہ وہ انسان کو خوف و حزن سے بالاتر کر دیتا ہے اسلام میں نجات کا یہی مفہوم ہے۔

ہر اس ایمان میں صداقت کا جزو موجود ہوتا ہے جس نے انسان کے لیے

کسی قسم کی ظاہری و باطنی فلاح پیدا کی ہے۔ ایمان فلاح ہی کی دعوت ہے۔
 ایمان استوار ہو کر ایک جذبہ انگیز اور خلاق و جدالِ حیات بن جاتا ہے۔
 ایمان سے زندگی میں وقار پیدا ہوتا ہے اور تکریمِ آدم کا یقین پیدا ہو جاتا
 ہے۔ اور انسان محسوس کرتا ہے کہ میں مادیات و محسورات و معقولات سے بلند تر
 مخلوق ہوں۔ (ثقافت، خلیفہ نمبر، ۱۹۶۰ء)

نبی کریم کی تعلیم کے بنیادی عناصر

خاتم النبیین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی انتہائی لازمی خصوصیت اس کی وسعت اور ہمہ گیر ہوتے۔ بعثت محمدی سے قبل لافوراد انبیاء و صلحین و حکما گزر چکے تھے۔ اسلام نے مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان سب کی صداقت کا اقرار جزو ایمان ہے۔ لیکن مردِ پیام سے ہر جگہ حق و باطل کی آمیزش ہو گئی ہے اور ہر جگہ ادیان میں غلو پیدا ہو گیا ہے۔ اب اس کی ضرورت ہے کہ وہناحت کے ساتھ حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کیا جائے، اور اس کے علاوہ ان تمام اساسی حقائق کو ایک تنظیم میں یکجا کیا جائے جو مختلف زمانوں اور مختلف ملتوں میں منتشر ہیں۔ تعلیم محمدی کی اساس توحید ہے۔ اگر خدا کی ذات اور اس کے صفات کے متعلق انبیاء کا عقیدہ مشرک اور خالص ہو جائے تو باقی تمام صداقتیں لازمی نتائج کے طور پر حاصل ہو جاتی ہیں۔ گویا توحید ایک لبریز حیاتِ تحرر ہے، اور اگر قلبِ انسانی اس کی آبیاری کرے تو حیاتِ دکائیت کے تمام حقائق شراخ و شکوفہ و برگ و ثمر کی طرح اس کے اندر سے پھوٹنے لگیں گے، اور زندگی پھیلنے پھوٹنے اور پھیلتے پھٹنے کی۔ توحید ہی کے صحیح تصور سے یہ کائنات بھی قابلِ فہم ہو جاتی ہے اور زندگی کا مقصود بھی معین ہو جاتا ہے۔ حکمت یا سائنس کا کام کائنات کی کثرت اور ناگونی میں وحدتوں کی تلاش ہے جسے حکمت کی زبان میں قوانینِ ضرورت کہتے ہیں۔ بتدریج ان وحدتوں یا قوانین کو انجام کار ایک بنیادی وحدت میں منسلک کرنا حکمت کا منصب العین ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ منصب العین خدا ہے۔

والی دینک المنتہی

یہ منتہی مسدود بھی ہے۔ جس طرح کہ ایک ٹرک بچ و درخت کی ابتدا ہے اور انجام ارتقا میں

شر کی صورت میں اس کی انتہا بھی۔ توحید کے تصورات اسلام سے قبل انبیاء نے بھی پیش کیے اور حکمائے بھی۔ لیکن انسانوں کی پستی فکر نے ہمیشہ ان میں شرک کی آمیزش کر دی۔ یا بعض حکما کی طرح ان میں اس قدر منطقی تشریح پیدا کی کہ خدا بے صفات ہو گیا ایک جبر و تصور رہ گیا جس سے نہ عقل بہرہ اندوز ہو سکے اور نہ وہ عملی زندگی میں کام آسکے۔ قرآنی اسلام کا سب سے بڑا کارنامہ اس تصور کو خالص کرنا تھا۔ آئیں اس پر ایک سرسری نظر ڈالیں کہ ادیان عالیہ اور فلسفوں میں خدا کا تصور کس کس طرح مسخ ہو چکا تھا۔ ہندوؤں کے بلند مذہبی فلسفوں میں خدا کی ذات واجب الوجود کائنات سے اس قدر ماوری ہو گئی تھی کہ شکر چار یہ کی ویدانت میں خدا نرگن یعنی صفات سے محرا ہو گیا تھا۔ وہ کائنات کا خالق نہ تھا کیونکہ ذات مطلق حقیقی تھی، اور کائنات وہی مایا یا فریب اور اک۔ انسان کا جسم و نفس بھی کائنات کے ساتھ بے حقیقت ہو گیا تھا۔ خیر و شر کی پیکار بھی وہی تھی۔ اعمال اور ان کے نتائج بھی غیر حقیقی مظاہر کا تار پود تھے۔ ہما تہا بدھ نے برہمنیت میں بہت کچھ اصلاح کی کوشش کی۔ لیکن وہاں بھی نہ خدا نظر آتا ہے اور نہ نفس انسانی کوئی حقیقی جوہر رہتا ہے۔ سب اعراض ہی اعراض ہیں جن کی تہ میں کوئی جوہر نہیں، اور زندگی کا مقصود ان تمام دھوکوں سے نجات پانا ہے، اور یہ نجات تین تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ تمام آرزوؤں، یہاں تک کہ تناسل حیات کو بھی زنج و بن سے نہ اکھاڑ دیا جائے۔ برہمنیت اور بدھ مت نے زندگی سے گریز کی تعلیم دی تاکہ انسان اعمال اور ان کے تکراری چکر میں سے نکل جائے۔ ان مذاہب میں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ خدا کبھی کبھی انسان کی صورت میں بغیر عن اصطلاح دنیا میں اثر آتا ہے۔ ملکوت گیتا میں اس عقیدے کی نسبت ایک اشوک ہے جس کا فیضی نے یہ ترجمہ کیا ہے:

چوں بنیا دیں ست گرد بے برآریم خود را بشکل کے

عیسائیت میں بھی یہی افکار کا تصور تمام دین کا محور بن گیا اور مسیح علیہ السلام کو عیسائیوں نے عین خدا بنا دیا، جو دنیا میں انسان کی صورت میں اس لیے آیا کہ انسانوں کے ناقابل معافی گناہوں کا، جو اسے پہلو آدم سے ورثے میں ملے ہیں، کفارہ بن جائے

جن فلسفوں میں خدا کا تصور ملت سے وہاں بھی اس سے نہ کائنات و حیات کی توجیہ ہو سکتی ہے اور نہ وہ انسانی زندگی میں کسی کام آسکتا ہے۔ افلاطون کے ہاں خدا ناظم و صنّاع ہے لیکن اس صفت کا خاتم مواد اس کا پیدا کردہ نہیں ہے۔ اصل حقیقت اعیان ثابتہ کی ہے۔ خدا ان کے مقابلے میں ایک ثانوی حیثیت رکھتا ہے ارسطو کے ہاں خدا عقل خالص یا فکر محض ہے۔ اس فکر انہی کا موضوع و معروض وہ خود ہی ہے۔ موجودات سے اس کو کوئی واسطہ نہیں۔ وہ کلیات کا ایک منطقی نظام ہے جو زندگی کے جزئیات سے بے تعلق ہے۔ وہ نہ کائنات کا خالق ہے اور نہ اس کا رب اور ناظم۔ انسان کا انفرادی نفس ایک حادث منظر ہے جو خدا کے ساتھ دعا یا عبادت کا کوئی رابطہ پیدا نہیں کر سکتا۔ اس نفس کو بقا بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یونانی فلسفہ کی آخری صورت فلاطینوس اسکندر رومی کا فلسفیانہ تصوف ہے جس کے نمایاں نقوش عیسوی اور اسلامی متصوفانہ افکار میں ملتے ہیں۔ اس جدید افلاطونیت میں بھی خدا نہ خالق ہے اور نہ رب۔ وہ ذی ارادہ اور صاحب اختیار ہستی بھی نہیں۔ موجودات اس سے اس طرح سرزد ہوتے ہیں جس طرح سورج سے شعاعیں نکلتی ہیں۔ وہ اپنی ذات بحت میں تمام صفات سے معرا یعنی دیدانت کے عقیدے کے مطابق نہ گن ہے۔ اس اشباح نور میں جو ہستیاں اس سے جتنی قریب ہیں اتنی ہی منور ہیں۔ دوری کے ساتھ نور میں کمی اور ظلمت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے جسے ہم مادی کائنات کہتے ہیں وہ ظلمت کدہ ہے۔ انسان کا جسم بھی اس ظلمت کا ایک نمونہ ہے۔ ذات مطلق احدث مطلق ہے جس میں نہ ارادہ ہے نہ شعور۔ سب کچھ اسی سے بہ تشری سرزد ہوتا ہے۔ وہ خود نہ کبھی ہے نہ عظیم نہ بصیر۔ اب اس مختصر تمہید کے بعد ذرا اس کا جائزہ لیجئے کہ محمد رسول اللہؐ نے ہدایت دہی قرآنی اور بوسیلہ بصیرت ایمانی انسانوں کے سامنے خدا کا کیا تصور پیش کیا۔ اسلام کا خدا ایک ذی شعور اور ذی ارادہ خالق ہے۔ اس نے کائنات کو مقصد اور ارادے سے پیدا کیا۔ وہ خلاق ہے۔ اس کی صفت خالقانی ازلی وابدی

ہے۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے خلقت میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ اس کے ہاں حیات و وجود کے خزانے لاجی و دہیں لیکن وہ ہر چیز کو ایک انداز سے پیدا کرتا ہے۔ وہ خالق ہونے کے علاوہ ناظم بھی ہے۔ اس کے ارادوں میں تلون نہیں ہوتا۔ اس کی خلاقیت اس کی حکمت سے بھی ہم آغوش ہے اور اس کی رحمت عامہ سے بھی ہمکنار ہے۔ اس کی رحمت ہر چیز پر محیط ہے۔ وہ کائنات اور موجودات سے ماوریٰ بھی ہے اور اپنی قدرت، مشیت اور حکمت سے ذرے ذرے میں جاری و ساری بھی ہے۔ اس کی سنت یا عادت فطرت کے اندرائین آفرین ہے:

لن نجد لسنة الله تبدیلاً
اس کے آئین تبدیل و تحویل سے بری ہیں

فطرت انسانی کو اس نے اپنی فطرت کے مطابق وضع کیا ہے اس لیے انسانی زندگی کے بنیادی حقائق بھی حقائق الہیہ ہیں۔ انہی حقائق کا ادراک اور ان کے مطابق زندگی کو ڈھالنا دین کہلاتا ہے:

فطرة الله التي فطر الناس عليها
اللہ کی اس فطرت پر غور کرو جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا۔

یہی دین قیم ہے

ذالک الدین القیم

اللہ کے قانونِ خلق میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی

لا تبدل لی لخلق الله

اس کائنات میں انسان خدا کا شاہکار ہے۔ قرآن کا آدم مسجودِ طائف اور مسخر کائنات ہے۔ اس سے کوئی ایک فرد مراد نہیں بلکہ یہ انسانیت کا نصب العین ہے۔ خدا کا عابد اور ساجد ہونے سے وہ فطرت کی تمام قوتوں کا مجود ہو جاتا ہے۔ خدا کا محکوم ہو کر وہ کائنات پر حکمران بن جاتا ہے۔ اخلاق الہیہ کے تخلیق سے وہ خلافت کرنے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ انسان کے ممکنات کی کوئی انتہا نہیں کیونکہ زندگی کا ارتقا کہیں ختم نہیں ہوتا۔ اسلام نے خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ کائنات اور انسانیت کے تصور کو بھی درست کر دیا۔ اس نے کہا کہ خدا خلاق حقیقت ہے وہ باطل آفرینی نہیں کر سکتا۔ حیات و کائنات محض کھیل تماشا نہیں۔ مقاصد وجود

نہایت سنجیدہ و پابدار ہیں :

میں بنا ما خلقت هذا باطلا
اسے ہوا سے رب تو نے اسے بے حقیقت
نہیں پیدا کیا ہے۔

اسلام حریت و اخوت و مساوات کی تعلیم ہے۔ حریت یعنی آزادی آدمیت کے جوہر میں فطری طور پر موجود ہے۔ آدم نے حکم الہی کی خلاف ورزی کر کے آزادی کا ثبوت دیا۔ آزادی کے معنی میں یہ داخل ہے کہ اس کا غلط استعمال بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی۔ لیکن خلاف ورزی کے احساس کے بعد تائب ہونا بھی انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ آدم کے قصے کو بیان کر کے قرآن نے گناہ کا تصور بھی بدل دیا۔ عیسائیت نے آدم کی لغزش کو ناقابل معافی قرار دیا اور اس کے گناہ کو آئندہ آنے والی لائقناہی نسلوں کے لیے متواتر بنا دیا۔ نبی کریم کے ذریعہ سے انسان کو اس غیر منصفانہ تصور سے نجات ملی۔ قرآن نے کہا کہ ایک فرد کا گناہ اس کی انفرادی لغزش ہے اور تائب ہونے سے انسان اس کے خراب نتائج سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے۔ نیکیاں بدیوں کو مٹا میٹ کر دیتی ہیں :

ان الحسنات یذین السيئات
نیکیاں برائیوں کو دھو کر دیتی ہیں۔
ہر فرد اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ روحانی حیثیت میں کسی انسان کا بوجھ دوسرے انسان پر نہیں ڈالا جاتا :

لا تزداد ذرة وزر أخوی
کوئی شخص دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا
چونکہ خدا انسان کو اپنی فطرت پر ڈھالنا چاہتا ہے اس لیے وہ اس کے اختیار کو سلب نہیں کرتا۔ وہ ہدایت اور گمراہی کی راہوں کو واضح کر دیتا ہے۔ جس کا جی چاہے یہ راستہ اختیار کرے یا وہ۔ جو راستہ بھی اختیار کرے گا اس کے نتائج سے وہ گمراہ نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو تمام انسانوں کو بالجبر مومن بنا دیتے لیکن ہم نے ایسا کرنا نہیں چاہا۔ اس لیے کہ مجبور اور ایمان باہم منافی چیزیں ہیں۔ مجبور کے لیے نہ نیکی نیکی ہے اور نہ

بدی بدی۔ اور جبر کے بعد ثواب و عذاب کے بھی کچھ معنی نہیں رہتے۔ اسی لیے قرآن کریم نے علی الاعلان کہہ دیا کہ دین کے معاملے میں جبر نادر ہے:

لَا اكْرَاهُ فِي الدِّينِ دِينَ مَن كُنتَ بِجَبْرٍ تَهْتِكُ

جب خدا جو قادر مطلق ہے انسان پر جبر روا نہیں رکھتا تو کسی انسان کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی دوسرے انسان کو مجبور ٹھہرے یا غلام بنائے۔ اگر مسلمان قرآن کریم کی اس حکیمانہ تعلیم کے نتائج اخذ کر کے ان کا اطلاق پوری طرح معاشرت پر کرتے تو بیک قلم دنیا سے غلامی کا صفایا ہو سکتا تھا لیکن افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس معاملے میں ڈھیل برتی۔ غلاموں کے ساتھ سلوک دیگر اقوام کے مقابلے میں تو بہتر ہو گیا لیکن یہ انسانیت کش رسم باقی رہی۔ دین کے معاملے میں رواداری اسلامی تعلیم کا سب سے زیادہ قابلِ فخر پہلو تھا۔ لیکن روح اسلام سے بے گانہ مدعیانِ دین نے غیر اسلامی تنگ نظری اور تعصب سے کام لے کر خود مسلمانوں کے اندر جبر و قہر اور تکفیر کا بازار گرم کر دیا۔

قرآن نے نجات کو کسی ملت کا اہارہ قرار نہیں دیا اور جو لوگ شریعتِ محمدی کے دائرے میں داخل نہ ہو سکے ان کے ساتھ بھی کمالی درجے کی رواداری برتی۔ جس وقت یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے برسرِ پیکار تھے اس وقت بھی انصاف سے کام لے کر یہ کہا کہ دیکھو سب کے سب ایک جیسے نہیں ہوتے اور اہل کتاب میں بھی بڑے بڑے خدا ترس اور خدا پرست موجود ہیں، اور بعض دوسری ملتوں کا نام لے کر وضاحت سے کہا کہ ان میں کا جو فرد بھی خدا پرست، آخرت کا قائل اور انسانوں کا محسن ہے وہ نجات یافتہ ہے۔ ایسے لوگ اگر دوسری ملتوں میں بھی ہوں تو وہ اولیاء اللہ اور خوف و حزن سے بالاتر ہیں:

لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ خَنَ ان کے لیے خوف نہیں اور نہ وہ غمگین ہوں گے

محض اتفاق سے مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہونے والے مردم شمار ہی کے مسلمان اسلام یا نجات کے ٹھیکیدار نہیں۔ اسلام کی تعلیم کا جتنا حصہ جو فرد یا

جو ملت اپنائی ہے اتنی وہ اسلام سے بہرہ اندوز اور صلاح و فلاح کے قریب
ہے۔ نبی کریمؐ نے اعلان کیا کہ اسلام سب بادشاہی اور شہنشاہی کو منسوخ کر دیا ہے۔
لا قیصر ولا کسریٰ

لیکن مسلمانوں میں یہ ملعون چہرہ جلد واپس آگئی اور روح اسلام سے بے گانہ شعراء شیوخ نے ان مصادِر ضلالت کو ظلالِ اشد قرار دے کر مسلمانوں کی اجتماعی و انفرادی حریت کو مسخ کر دیا۔ اسلام نے زر، زمین کی سرمایہ اندوزی کے راستے بند کیے تھے مگر کھوڑے ہی عرصے میں یہ محزبِ انسانیت راہیں پھر کشادہ ہو گئیں اور ہمارے علمائے سوان کے جواز میں قرآن و حدیث کی تاویلیں کرنے لگے۔ اسلامی حریت کا ایک لازمی تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان زندگی کے حقائق پر آزادی سے غور و خوض کریں اور تغیرِ احوال کے ساتھ ساتھ اسلام کے ازلی اصول سے ہنسکامی طور پر فردِ رخ کو اخذ کریں۔ اسی کا نام اجتہاد ہے لیکن مسلمانوں کی زندگی کے جامد ہونے کے بعد یہ عقیدہ استوار ہو گیا کہ فقہ میں اجتہاد کا دروازہ چوتھی صدی ہجری کے بعد قیامت تک کے لیے بند ہو گیا ہے۔ اب مسلمانوں کے لیے فقط لکیر کا فقیر ہونا اور روایت پرستی باقی رہ گئی ہے۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو لازمی ہونا چاہیے تھا۔ بقول اقبالیہ امتِ روایات میں کھو گئی اور زندگی کی تخلیقی قوتیں جنھیں اقبالی عشق کہتا ہے ٹھٹھر کر رہ گئیں :

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے مسلمان نہیں راگ کا ڈھیر ہے

تھامے دیکھ اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھ

۱۰۰ رو و رہانہ کی منزل سے سیرا سی بھی دیکھ

لیکن مسلمان کے پاس خدا کی کتاب محفوظ ہے اور رسولؐ کے اُتوہِ حسنہ پر
نظر رکھنے والا اب بھی تمام برکات سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کو زندگی
کے بنیادی حقائق اور اصولی عمل و دوسروں سے اخذ کرنے کی ضرورت نہیں۔
اگر خدا ہے تو اس کا تصور اسلام سے غائب نہیں ہو سکتا۔ سچی آزادی

اور عدل و رحم کی تعلیم حقیقی اسلام سے بڑھ کر کہیں نہ ملے گی۔ حصولِ علم کی ترغیب قرآن سے زیادہ کسی مذہبی صحیفے میں نہ پاؤ گے۔ اسلام کا مقصود یہ ہے کہ اسی زندگی میں جمال و کمال پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ جو یہاں کو باطن ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہو گا۔ زندگی کی کسی جائز لذت کو اسلام نے حرام نہیں کیا۔ قرآن پوچھتا ہے کہ بتاؤ کون ہے جس نے اللہ کی زمینوں کو حرام کیا ہے؟ رہبانیت کو اسلام نے ممنوع قرار دیا تاکہ زندگی کی پیکار سے قرار نامکن ہو جائے حدود اللہ کو مد نظر رکھ کر زندگی بسر کرنے سے انسان پر عرصہ حیات تنگ نہیں ہو جاتا بلکہ خدائے لا محدود سے رابطہ پیدا کر کے زندگی لا محدود بن سکتی ہے۔

رسول کریم کی ہمہ گیر اور محیط کلی حیات طیبہ سے بہتر نمونہ تاریخ انسانی میں مفقود ہے۔ افلاس میں زندگی کس طرح بسر کی جائے۔ مال کے حصول کے بعد زندگی کا کیا ڈھب ہو۔ ایمان داری سے تجارت کس طرح کی جائے۔ ذراعت میں نفع اندوزی سے کس طرح پرہیز کیا جائے۔ ضرورت سے زیادہ مال کا کیا معاش ہے۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق و فرائض میں کس قدر مساوات ہے۔ صلح و جنگ کے آئین کیا ہیں۔ مسلمانوں کو آپس میں کیا برتاؤ کرنا چاہیے۔ غیر مسلموں کے ساتھ عدل و رواداری کا سلوک۔ جمہوری نظام مملکت، جس کا نظم و نسق اہل الرائے کے مشورے سے قائم کیا جائے۔ اقتصادِ ملی نظام جس میں دولت چھٹا ہاتھوں میں مرکوز نہ ہوتی جائے بلکہ سون کی طرح تمام جسم ملت میں رواں دواں ہو اور چند معین حدود کے علاوہ زندگی کے تمام شعبہ شعبوں میں مسلسل اجتہاد۔ یہ تھا اصل اسلام جس پر عمل کر کے رسول کریم اور صحابہ کرام نے دنیا کے سامنے عملاً ایک نصب العین پیش کیا۔ مسلمان اگر خود داری کے ساتھ مہذب اور ترقی پذیر زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو قرآن اور اسوۂ رسول کی طرف عود کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اگر دیگر اقوام نے اسلام کے بعض اہم پہلوؤں کو اپنا کر اپنی انفرادی اور اجتماعی

زندگی میں صلاح و فلاح پیدا کی ہے تو مسلمانوں کے لیے باعثِ شرم ہے کہ وہ دوسروں سے پیچھے رہ کر ان کی تقلید پر مجبور ہو جائیں۔ اصل اسلام، اور اسوۂ حسنہ رسولؐ کی طرف عود کر کے ملتِ اسلامیہ دوسروں سے بہتر نمونے پیش کر سکتی ہے۔ اس کا رسولؐ کوئی ماضی کی شخصیت نہیں۔ وہ انسانیت کے حالی اور مستقبل میں ہر قدم پر رہنمائی کر سکتا ہے بشرطیکہ جامد مسلمان رسولؐ کی رسالت کو بھی جامد نہ بنادیں۔ ختمِ نبوت کے یہی معنی ہیں کہ یہ نبوت اب ہمیشہ تک اقوام کی رہنمائی کر سکتی ہے۔

(ثقافت، جنوری ۱۹۵۷ء)

وحدتِ انسانی اور عقیدہ توحید

ازدوئے قرآنِ اصل دین اور مغزِ صداقت عقیدہ توحید ہے۔ مہدی رہی حقیقت سے اور خلقتِ حیات و کائنات، آفرینشِ انسان، آئین و قوانینِ مقصودِ زندگی، اخلاقی اور روحانی تعلیمات، تمام اسی مرکزی عقیدے کے مشتقات ہیں۔ اس عقیدے کی بدولت جو نظریہ حیات اور طریقِ عمل پیدا ہوا ہے اس کا نام قرآن نے اسلام بتویر کیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ بچا دین ہی ہے۔ اس سے متضاد جو عقیدہ اور طرزِ عمل ہے وہ باطل ہونے کی وجہ سے خدا کے ہاں مقبول نہیں۔ اس عقیدے کی نسبت قرآن میں یہ تعلیم بھی ملتی ہے کہ تمام اقوام و ملل میں اس عقیدے کی تعلیم دینے والے فرستادگانِ خدا مبعوث ہوئے۔ دینِ اصل میں ایک ہی تھا اور ایک ہی ہے۔ مختلف امتوں اور ملتوں نے اس عقیدے کو بگاڑ کر اور اس میں کچھ قطع و برید اور کچھ اضافہ کر کے ایک دین واحد سے مختلف ادیان بنا لیے ہیں۔ قرآن میں یہ دعویٰ کہیں نہیں ملتا کہ محمد رسول اللہ کا پیش کردہ دین کوئی نئی اور انوکھی تعلیم ہے۔ ابتر اسے آفرینشِ آدم سے لے کر بعثتِ رسولؐ تک دین ایک ہی رہا ہے اور قیامت تک دین ایک ہی رہے گا۔ اس ایک دین واحد میں تفریقیں کئی وجوہ سے پیدا ہوئیں۔ ایک بڑی تفریقہ انگیز وجہ یہ تھی کہ مختلف ادیان کے پیروں پر یہ حقیقت واضح نہ ہوئی کہ دیگر اقوام و ملل کے پیشوایانِ دین بھی ہادیانِ برحق تھے۔ جب کوئی نئی کسی قوم میں مبعوث ہوتا ہے تو پہلے اس کی اپنی قوم اس سے دست و گریبان ہوتی ہے۔ اس کو جھٹلاتی ہے۔ درپے آزار ہوتی ہے اور آمادہ قتل ہو جاتی ہے۔ لیکن انجام کار اس کے پیغام کو سمجھنے والے کچھ لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور

رفتہ رفتہ اس کا بولی بالا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پاتا کہ نبی کے پیغام اور اس کی تعلیم میں تخریب و تخریف رونما ہوتی ہے۔ حق کے ساتھ باطل کی آمیزش شروع ہو جاتی ہے۔ غلو کی وجہ سے بھی حق باطل میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خدا کے پیغام رساں نبی کو اس کی امت خدا کا مرتبہ دے کر اس کی پرستش شروع کر دیتی ہے۔ اس طرح ایک امت اپنے نبی کو تو خدا بنا دیتی ہے لیکن دوسری امتوں کے انبیاء کو سچا انسان بھی نہیں سمجھتی۔ اسی غلو اور تعصب کی بدولت نوع انسان متخاصم گروہوں میں بٹ جاتی ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عقیدہ توحید جو نوع انسان میں وحدت آفرین ہو سکتا تھا وہ عداوت بین الملل کا باعث بن جاتا ہے۔ مذہب نوع انسان کے لیے باعث عذاب بن جاتا ہے۔ مذہبی تعصب انسان کے انسان سے متحد ہونے میں مانع ہوتا ہے قرآن کے نزدیک اس قسم کے تمام متعصب لوگ کافر ہیں۔ ان کی نظر میں تنگی اور کچی آجاتی ہے، ان کے دل تنگ ہو جاتے ہیں۔ ان کے فکر میں وسعت نہیں رہتی۔ ان میں محبت کا جذبہ محو و مفقود ہو جاتا ہے۔ رواداری کا نشان نہیں رہتا اور دین کے بارے میں جبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اپنی ملت کے علاوہ باقی تمام ملتیں گردن زدنی بن جاتی ہیں۔ غرضیکہ مذہب فلاح کی بجائے فساد کا باعث بن جاتا ہے۔ دیکھیے قرآن نے کس قدر وضاحت سے اس ناگوار حالت کا نقشہ کھینچا ہے، جو عذاب ہمیں میں منہج ہوتی ہے :

ان الذین یکفرون باللہ ورسولہ
ویریدون ان یفسدوا بین اللہ
ورسلہ ولیقولون نؤمن ببعض
ونکفر ببعض ویریدون ان
یتخذوا بین ذالک سبیلاً
اولئک هم الکفرون حقاً

جو لوگ اللہ اور اس کے انبیاء میں تفریق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بعض کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے اور بین چدنا چاہتے ہیں، یہ لوگ صحیح معنوں میں کافر ہیں اور ہم نے ان کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا

واعتدنا للكفرين عذاباً مهيئاً
والذين امنوا بالله ورسوله
ولم يفرقوا بين احد منهم اولئك
سوف يؤتيهم اجرهم وکان
الله غفوراً رحیماً

ہے اور جو لوگ اللہ اور اس کے انبیاء
پر بلا تفریق ایمان لائے ہیں ہم ان کو
اس صالح عقیدے کا، عنقریب اس کا
اجر دیں گے۔

اس آیت میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ جس رہو اکن عذاب کی وعید ہے وہ
ان کی حالت سے اسی حیاتی و فیوی ہی میں روٹا ہوتا ہے۔ اسی طرح عقیدہ
صالح کے مفید نتائج بھی امن عامہ کی صورت میں نہیں ظاہر ہو جاتے ہیں۔
قرآن میں پیش کردہ اسلام کے دو اہم ارکان ہیں۔ ایک وحدتِ الہ دوسرا
وحدتِ انسان۔ جس کی بنیاد ایک تو نوع انسان کا واحد اخذ ہے اور دوسری بنا
وحدتِ ادیان ہے۔ اس کی صراحت قرآن میں یوں ہے:

خلقکم من نفس واحدة
ما کان الناس الا امة واحدة
فاختلفوا

اس نے تمہیں ایک ہی جوہر حیات سے پیدا کیا
انسان ایک ہی امت ہیں لیکن لوگوں نے
اختلاف پیدا کر لیا۔

وان من امة الا خلا فيها نذیر
ولکل قوم حاد

ہر امت میں نذیر پیدا ہوتے رہے ہیں۔
ہر قوم میں ہادی ہو سکتے ہیں۔

قرآن نے یہ بھی کہا کہ خدا کے نزدیک تمام انبیاء راستی پر تھے۔ ان تمام کا
درجہ اللہ کے ہاں متفاوت ہے۔ بعض کو بعض پر فضیلت ہے۔ لیکن بنیادی لحاظ
سے ان میں فرق کرنا درست نہیں۔

انسانوں کے لیے بھی مناسب اور واجب ہے کہ وہ یہ کہیں کہ ہم ان
میں فرق نہیں کرتے۔ انسانوں کے لیے ایک پیشوا سے دین کو دوسرے سے
افضل قرار دینا مناسقات و فسادات کا باعث ہوتا ہے۔ اسی قرآنی ہدایت
کی توجہ یہ ہیں رسول کریم نے یہ شریا کیا کہ تم یہ بھی نہ کہو کہ میں یونس ابن ممتی سے

بھی افضل ہوں۔

امریکہ کے خطباتی دورے میں میں نے ایک بڑے کالج میں اسلام کے عقیدے
توحید اور اس کے مشتقات پر ایک لیکچر دیا تھا۔ اس کے بعد ایک پادری میرے درپے
ہو گیا کہ بتاؤ مسیح اور محمدؐ میں تم کس کو افضل قرار دیتے ہو۔ میں نے کہا کہ خدا اور
رسولؐ نے مجھے اس قسم کے مباحث میں پڑنے سے منع کیا ہے کہ ایک نبی کو دوسرے
سے افضل قرار دیا جائے۔ ان کے مدارج میں اگر کچھ تفاوت ہے تو اس کا علم
خدا سے عظیم کہے انسانوں کو اظہارِ تفضل کی ممانعت کی گئی ہے۔ کیونکہ اس سے
جہالتانہ تعصب پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

کُلُّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَصَلَّوْا عَلَیْہِ وَکَلِّیْہِ سب مسلم اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے صحیفوں
ورسلہ لا انفراق بین احد من ہر اس کے رسولؐ پر اور آخرت پر ایمان رکھتے
رسولہ۔ (البقرہ) ہیں اور (مقابلہ و موازنہ سے) ان میں تفرق نہیں کرتے
شدید گمراہی یا گھبراس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص خدا اور ملائکہ اور اس کی کتابوں اور
رسولوں کا منکر ہو۔ ومن یبغض باللہ وصلَّوْا عَلَیْہِ وَکَلِّیْہِ ورسلہ والیوم والآخر
فقد ضلّ ضلالاً بعيداً (النساء)

امتوں میں تفرق کا ایک اور سبب عبادات و مناسک اور مناسک و
شمار کا فرق بھی ہے۔ اس کے علاوہ معاملات کے بارے میں رسوم و رواج اور
قوانین میں بھی تفاوت پایا جاتا ہے۔ اس فرق کی وجہ کچھ تو قوموں کا تفاوت مزاج
ہے اور کچھ تاریخی، معاشی اور جغرافیائی حالات کی گونا گونی۔ قرآن اس قسم کے عارضی
اور فروعی اختلافات کو ماہ النزاع بنانے سے روکتا ہے۔

لکل امة جعلنا منسکاً معیناً سکوت ہر قوم کا طریقہ عبادت جدا ہے۔ اس بارے میں
خلافہ بینا زعلت فی الامر۔ ہرگز تنازع جائز نہیں۔

ہر قوم کا قبلہ عبادت جدا ہے۔ قبلوں کا اختلاف کوئی بنیادی اہمیت نہیں رکھتا۔
مشرق میں بھی وجہ اللہ ہے اور مغرب میں بھی وجہ اللہ۔ تمام سمتیں خدا ہی کی ہیں۔

لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ جدھر منہ کرو اللہ ہی اللہ ہے۔ جدھر دیکھتا ہوں ادھر تو ہی تو ہے۔ اپنے اپنے طریق عبادت پر قائم رہتے ہوئے بھی تمام ملتوں کو نیکیوں کے حصول میں سبقت کی کوشش کرنی چاہیے۔

وَلَكِنْ وَجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّیْهَا۔ فَاتَّبِعُوا۔ ہر ایک کا ایک رخ ہے جدھر وہ مڑا ہوا ہے الخیرات۔ لہذا نیکی کی طرف سبقت کرو۔

اینا تولوا فتحہ اللہ لکلی جعلنا منکم شرعاً ومنہا جاً۔ جدھر بھی رخ کر دے ادھر ہی خدا کا رخ ہو گا تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے قانون اور اس کو بروئے کار لانے کا طریقہ بنا دیا ہے۔

یہود و نصاریٰ نے جو محمد صلعم کو نبی تسلیم کرنے اور ان کی پیروی سے انکار کیا تو اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے منہاج و شعائر الگ تھے۔ ان کی شریعتیں رسول اکرمؐ کی پیش کردہ شریعت سے بہت کچھ متفاوت تھیں۔ اسی لیے قرآن نے کہا کہ اے محمدؐ! یہ لوگ کبھی تم کو نہ مانیں گے جب تک کہ تم ان کی ملتوں کی پیروی پر آمادہ نہ ہو۔ ملتوں کی پیروی سے مراد ان کے تمام منہاج و شعائر اور مشرائع کی پیروی ہے۔ یہود و نصاریٰ سے اس قسم کی ہم آہنگی محمد رسول اللہؐ جیسے انقلاب آفریں مصلح اعظم کے لیے ناممکن تھی۔ کسی انقلابی اصلاحی تحریک کے معنی ہی یہ ہیں کہ بنیادی عقائد کی اصلاح کے علاوہ انداز معاشرت میں بھی اہم تبدیلیاں پیدا کرے۔ اگر رسول کریمؐ عقیدہ توحید ہی کو کچھ اندیشوں سے پاک کر دیتے تو یہ بھی ایک عظیم الشان کام ہوتا لیکن عبادت و قوانین میں بھی اہم تبدیلیوں کے بغیر دین کی تکمیل ممکن نہ تھی۔ جو مصلح اعظم آتا ہے وہ لازماً زمانے کے انداز و ساز بھی بدلتا ہے۔ جو کہ نہ پرست اس کی مخالفت پر کمر بستہ ہوتے ہیں ان کا محرک تبدیلی اصلاح عقیدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ آداب و اطوار و آئین میں ایسی تبدیلیاں ان کو ناگوار ہوتی ہیں جن پر ادنیٰ مفاد پرستی یا قدامت پسندی نے تقاضا کی ضرورت رکھی ہے۔ ہر قوم فقط اپنے عقائد ہی کو دین نہیں سمجھتی بلکہ تمام ظواہر و شعائر

عقائد سے بھی بڑھ کر دین شمار ہوتے ہیں۔ ملتوں میں خاصیت اور مخالفت، اور
عصبیت زیادہ تر انھیں ظواہر نے پیدا کر رکھی ہے۔ ہند اور پاکستان کے ادیان
پر نظر ڈالیے تو انسانی فطرت کی کچھ اندیشی بخوبی واضح ہو جاتی ہے۔ ہندو دھرم کسی
معین عقائد کا نام نہیں۔ خدا کو ماننے والے، خدا کے منکر، دیوتا پرست، دیوتاؤں
کے منکر، ویدوں کو ماننے والے اور ویدوں کے منکر، کرشن کو اوتار ماننے والے
اور اس کو معمولی اخلاق سے بھی معرا سمجھنے والے، غرضیکہ ہر قسم کے خوش عقیدہ،
بد عقیدہ اور بے عقیدہ ہندومت سے خارج نہیں ہو سکے بشرطیکہ وہ چند
ظواہر کے پابند رہیں۔ ان ظواہر میں ذات پات اور چھوت چھات کو مرکزی
حیثیت حاصل ہے۔ امید کرنے بہت درست کہا تھا کہ اگر ہندومت اس
تفریق کو بھی چھوڑ دے تو وہ کچھ نہ رہے گا کیونکہ اس کے سوا کوئی مشترک عنصر
اس قوم میں نظر نہیں آتا جو ہندو کہلاتی ہے۔ ہندو صوفی رام تیر تھنے بالکل درست
کہا کہ ہندومت رسوائی یا مصلح کا مذہب رہ گیا ہے۔ کیا کھانا اور کس طرح کھانا
اور کھانے کو کس کی چھوت چھات سے بچانا، سب زور اسی پر ہے اور عقائد کو
کوئی نہیں پوچھتا۔ یہی حال سکھوں کا ہے، اس مذہب میں سب سے زیادہ اہمیت
اس بات کو حاصل ہے کہ جسم کے کسی حصے کے بال نہ تراشے جائیں۔ ہر قسم کی
بد اخلاقی اور بد عقیدگی کے باوجود ایک سکھ، سکھ رہتا ہے اور ملت اس کو خارج
نہیں کرتی۔ لیکن بال تراش دینے کے بعد مذہب کا بھی صفایا ہو جاتا ہے۔ گویا کہ
تمام دین سمٹ کر بالوں ہی میں الجھ گیا ہے۔ پنڈت انرو نے ایک مرتبہ کہا کہ ہندو
کلہر اب زیادہ تر گوبری ہو گیا ہے۔ گائے اور اس کے بول و براز کو بھاپیت حاصل
ہے وہ نہ کسی عقیدے کو حاصل ہے اور نہ کسی عمل کو۔ ملتیں ایک دوسرے کے
شعائر کی مہنسی اڑاتی ہیں۔ مگر جس ملت کے جو شعائر ہیں وہ اس کے نزدیک نہایت
ضروری اور پسندیدہ ہوتے ہیں۔ انھیں شعائر کی نسبت قرآن کریم نے کہا کلی
حشر اب یہاں بیہوش خون۔

عبادات و اعمال و شعائر میں ہر ملت کو اپنے طریقے پسند ہیں۔ مگر قرآن اکتا ہے کہ نوعِ انسان میں وحدت و اشتراکِ عمل ان اختلافات کے باوجود پیدا ہو سکتا ہے اور اس سمت میں اسلام کی کوششوں کا خود قرآن شاہد ہے۔ جب اس امر کا تجربہ ہو گیا کہ ایسے مذاہب کے پیروجن کی اہل توحید تھی محض شعائر اور شرائع کے اختلافات اور مصنوعی امتیازات کی وجہ سے ہر سر پیکار رہتے ہیں تو قرآن نے ان کے پیروں کو یہ دعوت دی کہ ہم ایک بنیادی بات پر یکجا ہو جائیں جو ہم میں اور تم میں مشترک ہونی چاہیے۔ اخلاقیات کے بنیادی عناصر تمام مذاہب اقوام اور ادیانِ عالیہ میں مشترک ہوتے ہی ہیں۔ زنا، چوری، ظلم، قتل، ناروا کس مذہب میں جائز ہے؟ اس کے علاوہ اگر عقیدہ توحید میں بھی ہم آہنگی پیدا ہو جائے تو مذاہب و دنیا میں بہت حد تک وحدت پیدا ہو سکتی ہے۔

قل یا اہل الکتاب اتعالموا الی کلمۃ
سواء بیننا و بینکم لا نعبد الا
اللہ ولا نشرك بے شیداً ولا
یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من
دون اللہ۔

کہہ دو کہ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی
طرف آؤ جو ہمارے تمہارے درمیان یکساں
ہو اور وہ یہ ہے کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ
نہ کریں اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ کریں اور ہم میں
سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے مقابلے میں

دب نہ بنائے۔

(ثقافت، مئی، ۱۹۵۹ء)

قرآن کریم میں حکمت کا مفہوم

قرآن کریم کے اندر خود اسی کتاب مقدس کے کچھ صفات اور امتیازی خلائق بیان کیے گئے ہیں۔ کہیں اسے کتاب 'لاریب فیہ' کہا ہے کہ اس میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ یقینی ہے اس کے اندر شکوک کی گنجائش نہیں۔ کہیں اسے فرقان کہا گیا ہے جو حق و باطل کو دو ٹوک الگ الگ کر دے۔ کہیں اس کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے جو زندگی کی ظلمتوں کو دور کرتا اور ارواح انسانی کو منیر و مستنیر کرتا ہے۔ کہیں اس کے متعلق یہ دعویٰ ہے کہ وہ نبی اُمّی جو اس قرآن سے فیض یافتہ ہے یہود و رسوم و رواج اور گمراہ ادیان کی پینائی ہوئی زنجیروں کو توڑتا اور توہمات کے طوق سے انسانوں کی گلو خلاصی کراتا ہے۔ کہیں یہ بیان ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے اہم شعبوں کے متعلق مفصل تعلیم موجود ہے۔ کہیں یہ ارشاد ہے کہ تم اس کے اندر کوئی داخلی تضاد نہ پاؤ گے اس کی تمام تعلیمات باہم متوافق ہیں۔ ہر صفت اس کتاب اور اس کی تعلیم کا کوئی اہم پہلو بیان کرتی ہے۔ مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے :

(۱) ذٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کے شبہ و شک کی گنجائش نہیں)

(۲) هٰدِیًۭیۡ لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالنُّزۡۤهَانِ (یہ کتاب لوگوں کے لیے ہدیٰ ہے ہدیٰ کے واضح دلائل ہیں اور "فرقان" ہے)

(۳) وَاتَّبِعُوا النَّوۡسَ الَّتِیۡۤ اُنۡزِلَ مَعَهُۥ ۚ وَهُوَ "نور" کی پیروی کرتے ہیں جو رسول اُمّی کے ساتھ نازل کیا گیا)

(۴) وَلَیۡضَعَنَّ عَلَیۡہُمۡ اَصۡحٰۤہُمۡ وَالۡلّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ (اور وہ اس

بوجھ و اطواق کو ان پر سے ہٹاتا ہے جو ان پر پڑی تھیں)

(۵) و نزلنا علیک الكتاب تبیاناً لکل شیء (ہم نے تم پر وہ کتاب اتاری جو تمام چیزوں کی تفصیل پر مشتمل ہے)

(۶) لو کان من عند غیر اللہ لو وجدوا فیہ اختلافا کثیرا (اگر یہ کتاب غیر خدا کی طرف سے ہوتی تو اس میں بڑے اختلافات دیکھتے)

لیکن اس مختصر مضمون میں ہم قرآن کریم کے اس دعوے کو جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ قرآن حکیم ہے، وہ حکمت واسے حکیم مطلق کی نازل کردہ کتاب ہے، اس لیے اس کے اندر حکمت سموی ہوئی ہے۔ یہ کتاب حکمت کو حیر کثیر بھی کہتی ہے:

من یزنی الحکمة فقد اوتی خیرا کثیرا

انبیاء کے وظیفہ نبوت کے متعلق بھی ارشاد ہے کہ وہ انسانوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ غور طلب بات یہ ہے کہ کتاب کے ساتھ ساتھ حکمت کا بیان بالالتزام کیوں آتا ہے اور حکمت کے کیا معنی ہیں۔ ذیل میں کچھ آیات درج کی جاتی ہیں جن میں کتاب و حکمت کا ساتھ ساتھ ذکر ہے:

(۱) لما اتیتکم من کتب و حکمة (۸۱:۳) (اے پیغمبر! ہم

نے جو تمہیں کتاب و حکمت دی)

(۲) یعلّمکم الكتاب والحکمة (۲۴:۲ و ۲۵:۲۱) (یہ

رسول ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے.....)

(۳) یعلّمکم الكتاب والحکمة (۱۵۱:۲) (تمہیں کتاب و حکمت

سکھاتا ہے)

(۴) یعلّمکم الكتاب والحکمة (۲۸:۳) (اللہ میسج کو کتاب

حکمت سکھاتا رہا)

(۵) فقد اتینا الی ابراہیم الکتاب والحکمة (۵۲:۴)

(اور ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت عطا کیں)۔

(۶) وانزل الله عليك الكتاب والحكمة (۳: ۱۱۳)

اور اللہ نے آپ پر کتاب و حکمت نازل فرمائی۔

قرآن کریم کے اندر زندگی کے ہر اہم شعبے کے متعلق احکام موجود ہیں لیکن کہیں قرآن اپنے آپ کو کتاب الاحکام نہیں کہتا۔ اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں کہ احکام صادر ہوتے ہیں برہنہ حکمت اور ہر حکم کی تہ میں کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے جو النفس و آفاق پر غور و خوض کرنے والوں پر ہی منکشف ہو سکتی ہے۔ حکم کو محض بحیثیت حکم پیش کرنا اور اسے واجب الاطاعت گردانتا مطلق العنان حکمرانوں کی امریت سے سرزد ہو سکتا ہے جو بے چون و چرا محکوموں سے فرمانبرداری کے طالب ہوتے ہیں۔ لیکن خدائے کائنات محض حاکم نہیں بلکہ حکیم بھی ہے۔ افلاطون کی مشہور کتاب 'جمہوریہ' میں سقراط کی زبان سے یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسانی جماعتوں اور ملتوں میں تب تک عدل حقیقی قائم نہیں ہو سکتا جب تک یہ صورت پیدا نہ ہو کہ یا تو حکمران بن جائیں یا حکمران حکما بن جائیں۔ ملتوں میں اندرونی اور بیرونی فساد کی وجہ یہی ہے کہ جو حاکم اور صاحب اقتدار بن جاتے ہیں وہ حکمت سے محروم ہوتے ہیں اور جو مرد حکیم ہے اسے سیاسی اقتدار حاصل نہیں ہوتا۔ افلاطون اور سقراط نے قریباً اڑھائی ہزار سال قبل حکومتوں کے جس انداز کو بیان کیا ہے وہ انداز اب بھی کم و بیش ہر حکومت میں پایا جاتا ہے۔ قرآن ایسے خدا اور خدائی فطرت کو پیش کرتا ہے جو حاکم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہے، اس کے ہاں سے ہر حکم کسی نہ کسی حکمت سے سرزد ہوتا ہے۔ بے اصول حکمرانی خود خدا بھی نہیں کرتا جو قادر مطلق ہے۔ خدا مادی ہے صرف انسانوں کا مادی نہیں بلکہ حجر و شجر، اور شمس و قمر اور ہر ذرہ کائنات کا مادی ہے۔

سب سے بڑا عظمیٰ کل شیء خلقہ ثم ہدٰی ہمارے رب نے ہر شے کو اس کی مخصوص بناوٹ

عطا کی پھر اس کی رہنمائی کی۔

کوئی ہدایت بھی محض حکم نہیں ہوتی ہر ہدایت کا سرچشمہ بھی کوئی علت غائی ہوتی ہے اور اسی علت میں اس ہدایت کی حکمت مضمر ہوتی ہے۔ خدا نے دیکھا کہ دنیا کے حکمران کم و بیش حکمت سے معرا ہوتے ہیں۔ ان کے خاندان میں شخصی یا خاندانی یا طبقاتی خود غرضی پنہاں ہوتی ہے۔ ان کے ہاں عدل بے لوث نہیں ہوتا۔ لیکن انسانوں کو ہدایت اور عادلانہ زندگی کی بے حد ضرورت ہے۔ اس لیے خدا نے انبیاء کو مبعوث کیا جو خدا کے حکیمانہ احکام لوگوں کے سامنے پیش کریں اور ان کو نافرمانی کی کوشش کریں۔ لیکن ہر نبی کو مسیت الہی نے یہ توفیق عطا نہ کی کہ وہ دنیاوی زندگی میں صاحب اقتدار حکمران بھی بن جائے۔ اکثر کے سپرد ہی وظیفہ ہوا کہ وہ صاحب اقتدار طبقوں کے خلاف خدا کے احتجاج بلند کریں اور انسانوں کے ضمیروں کو بیدار کریں۔ ان کو ان کے اعمال کے نتائج سے آگاہ کریں اور معاشرتی عدل پر آمادہ کریں۔ ان میں سے اکثر کی صدا صدابہ صحرارہی یا ضامرانسانی میں محض ہلکی ہلکی لہریں پیدا ہوئیں۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ سب انبیاء اور انواری کی تلقین کے ساتھ ساتھ حکمت آموزی بھی کرتے تھے۔ وہ صاحبان حکمت بھی تھے۔ وہ اعمال کے فطری اسباب و علل سے بھی لوگوں کو آگاہ کرتے تھے، اور جو کچھ وہ کہتے تھے اس کے معقول ہونے کی کچھ نہ کچھ وجہ بھی بتاتے تھے۔ نفوس انسانی کی بیماریوں کی تشخیص کرتے اور ان کا علاج بھی تجویز کرتے تھے عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انبیاء اور حکماء دو الگ الگ گروہ ہیں، اور اس تفریق کی بنا پر یہ تصور ہے کہ انبیاء جو کچھ کہتے ہیں وہ استدلال سے محال کر، حکمت نہیں ہوتی، بلکہ براہ راست مبدء فیاض سے ماہل کر وہ ہدایت ہوتی ہے اور حکماء کے متعلق یہ تصور ہے کہ وہ محض عقل اور مشاہدہ سے فطرت کا مطالعہ کرتے ہیں، اور استقراء، استخراج اور قیاس سے نتائج اخذ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن بھی نبوت اور حقیقی حکمت میں کوئی حد فاصل قائم نہیں کرتا۔ وہ اکثر انبیاء کا ذکر کرتے ہوئے یہ بھی کہتا ہے کہ ان کو حکمت بھی عطا کی گئی۔ اس سے یہ نتیجہ

نکلتا ہے کہ ہر نبی حکیم بھی ہوتا ہے لیکن ہر حکیم نبی نہیں ہوتا۔ اصل حکمت وہ ہے جو نبوت کے ساتھ وابستہ ہو۔ اگر حکمت نبوت سے مطلقاً منقطع ہو جائے تو اس کے دو ہی نتائج ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی حکمت محض ظن آفرینی اور استدلالی بھول بھلیاں ہو اور دوسرے یہ کہ وہ مظاہر فطرت کے کسی گوشے کے متعلق کوئی جزئی معلومات ہو جو براہ راست انسانی زندگی میں موثر نہ ہو۔

حکمت کے مفہوم میں ذرا مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔ یہ لفظ دینیات سے الگ ہو کر کبھی فلسفہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی سائنس کے معنوں میں فلسفہ کے مسائل اور دین کے مسائل بہت حد تک مشترک ہوتے ہیں اور ان مسائل کے حل کے راستے کچھ دور تک متوازی چلتے ہیں۔ لیکن خاص حدود سے آگے طرز استدلال اور حقیقت رسی کے وسائل ایک دوسرے سے ممتاز اور مختلف ہو جاتے ہیں۔ فلسفی بھی زندگی کی اساسی اور کئی حد افقوں اور بنیادی حقیقتوں کو بیان کرتا ہے اور دین بھی انہیں حقائق کا نام ہے۔ عقل ایک خدا داد جوہر ہے اور انسان کی اتنی یازی خصوصیت ہے اسی لیے قرآن نے عقل کو استعمال کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ وہ جو تعلیم بھی بذریعہ وحی ربانی پیش کرتا ہے اس کے متعلق ساتھ ہی کہہ دیتا ہے کہ تفکر اور تدبر کرنے والے اولوالالباب اگر اچھی طرح مشاہدہ، مطالعہ اور استدلال کریں گے تو اس کو درست پائیں گے۔ عقل و وحی کا امتیاز اور فرق موجود ہے۔ لیکن قرآن کے باہمی تحالف کا قائل نہیں۔ اگر ان میں تحالف ہوتا تو قرآن اپنے آپ کو حکمت کی کتاب نہ کہتا، اور نہ مظاہر فطرت کے مطالعہ سے حقیقت رسی پر اس قدر زور دیتا۔ قرآن کی تعلیم میں یقین موجود ہے کہ حکمت کا صحیح استعمال انجام کار حقائق دینیہ کی ضرورتاً پیدا کرے گا۔ قرآن حکیمانہ ہمد و جہد کو جزو دین اور جزو عبادت سمجھتا ہے۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ شرح صدر سے سوچنے والے فلسفی اور نبی میں فرق کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ نبی کے دل صرف مشاہدہ کا مآستانہ اور

استدلال ہی نہیں بلکہ براہ راست کچھ حقائق کا وہدان اور ادراک ہے۔ یقین فلسفی میں بھی پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ علم یقین کی حد تک رہتا ہے۔ اسی سے آگے عین یقین اور آگے بڑھ کر حق یقین کا درجہ ہے۔ یہ آخری دو درجے محض استدلال سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ سوانح میں ابوسعید ابوالخیر مشہور صوفی اور اس کے ہم عصر بوعلی سینا کی ملاقات کا ذکر ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بوعلی ان کے سامنے حقائق حیات و کائنات پر عقلی گفتگو کرتا رہا اور از روئے عقل و حکمت ان تمام حقائق کی تائید کرتا گیا جن کی تعلیم دین میں ملتی ہے۔ ابوسعید نے اس تمام حکیمانہ استدلال کے جواب میں فقط یہ کہا: ”ہرچہ تو می دانی من می بینم“ یہ دانش اور بینش کا بہت بڑا فرق ہے۔ اس فرق کو اقبالؒ نے بھی بجا مختلف دل کش پیرایوں میں بیان کیا ہے:

عقل گو آستان سے دور نہیں اس کی تقدیر میں حضور نہیں
یہ حضور وہی ہے جسے کوئی مشاہدہ کرتا ہے کوئی وہدان کہتا ہے کوئی مکاشفہ
کہتا ہے۔ انبیاء کے ہاں اس کی جو صورت اور جو درجہ ہے اسے وحی کہتے ہیں۔
اقبالؒ نے اس کے لیے عشق کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ رومی اور بوعلی کا
مقابلہ کرتے ہوئے وہ اسی عشق کو سوز و دل قرار دیتا ہے، جس کے بغیر عقل خشک
حقیقت شناس نہیں ہو سکتی۔ اقبالؒ کے نزدیک حکمت ایک ٹھنڈی اور
بے سوز آگاہی ہے:

حق اگر سوز سے نثار و حکمت است شعر سے گرم و سوز از دل گرفت
بوعلی اندر غبارِ ناقہ گم دست رومی پر وہاں محمل گرفت
عشق اور سوز، وہدان اور مشاہدہ کے بغیر حکمت بغیر کشیدہ سوز کے باوجود خیر
کا مل نہیں بنتی۔ نبی کے دِل وہدان و فکر اور قول و فعل سب ہم آہنگ ہوتے ہیں۔
حکیم عقلی کے ہاں یہ ہم آہنگی لازمی نہیں۔
بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور حکیم سرِ محبت سے بے نصیب نہ

حکما کی وہ قسم جنھیں فلسفی نہیں بلکہ سائنس دان کہتے ہیں الگ نوعیت کی ہے۔ خارجی اور باطنی فطرت کے بے شمار مدارج اور بے شمار شعبے ہیں۔ فطرت کے مظاہر کی نوعیت الگ الگ ہے۔ کہیں مادی مظاہر ہیں، کہیں نباتی، کہیں حیوانی۔ کہیں اجرام فلکی کا عالم ہے، کہیں انسانی جسم کا مطالعہ ہے، کہیں اس کی نفسیات کا۔ خدا کے واحد کی کائنات ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ اس کا کوئی حصہ دوسرے حصوں سے مطلقاً بے تعلق نہیں۔ لیکن اس وحدت کے اندر ایک بہ پایاں تنوع اور کثرت ہے جو ہر ایک وقت کسی انسان کے محدود مطالعہ اور مشاہدہ اور استدلال کے احاطے میں نہیں آسکتی۔ انسان کی محدود قوتوں نے مطالعہ عالم کے مطالعہ کے لیے ان کو الگ الگ ابواب میں تقسیم کر دیا تاکہ کسی ایک شعبے کے آئینہ اور اک کی گرفت میں آسکیں۔ کوئی سائنس دان تمام عمر ایک کپڑے کے مطالعہ میں صرف کر دیتا ہے کوئی انسان کے کسی ایک عضو کے اعمال و وظائف میں نہارت پیدا کرتا ہے۔ کوئی ذرے یا ایٹم کی اقصاء تحقیق میں منہمک ہے۔ یہ سب حکمت ہی کے گرویدہ اور اسی کے متلاشی ہیں۔ لیکن جزوی حقائق کی تحقیق کے لیے جزوی ہی عقل ہی استعمال ہوتی ہے۔ علوم میں جس قدر تخصیص ترقی کرتی جاتی ہے اسی قدر ایک سائنس دان ایک جزو کا عالم ہونے کے ساتھ ساتھ دیگر اجزائے حیات و کائنات سے جاہل مطلق ہوتا جاتا ہے۔ وہ کم سے کم چیز کے متعلق زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش میں کلیات حیات سے بے گانہ ہو جاتا ہے۔ لیکن زیر تحقیق جزو کے بھی اگر وہ تمام پہلو جان جائے تو وہ بھی حقائق کلیہ سے آشنا ہو جائے، مگر وہ خود اپنے مطالعہ کو خاص حدود کے اندر کر لیتا ہے۔ ہر جزو ایک کُل کا جزو ہے اور وہ کُل پھر کسی اور کُل کا جزو ہے انی لانتا علی۔ مشہور انگریز شاعر ٹینیسن ایک پھول کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اگر مجھے تیری پوری حقیقت معلوم ہو جائے تو انسان اور خدا کی معرفت بھی مجھے حاصل ہو جائے۔ قرآن کریم میں حکمت کا تصور اور نصب العین یہی ہے۔ قرآن فطرت کے مطالعہ

کی تلقین کرتا ہے۔ لیکن یہ تاکید کرتا ہے کہ فطرت کے ہر مظہر کو اس کے مصدرِ مطلق اور خلاق واحد کے ساتھ وابستہ کر کے سمجھو اور یہ دیکھو کہ فطرت کلی اور فاطمہ السموات والارض کے ساتھ اس کا رابطہ کس قسم کا ہے اور کس طرح ہر جزو کلی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ قرآن کے نزدیک حکمت اسی کا نام ہے۔ فطرت کے جزوی مظاہر اور ان کے مطالعہ میں کھویا جانا حکمت نہیں۔ وہ حکمت جسے قرآن خیر کثیر کہتا ہے محض انسانی اعمال اور ان کے متعلق احکام سے بلند تر چیز ہے۔ اگرچہ انسان کے صحیح اعمال اسی حکمت سے سرزد ہوتے ہیں، کیونکہ انسان کے اعمال کائنات کی حقیقت کلی سے منقطع اور الگ نہیں ہو سکتے۔ ایک حکمت وہ ہے جو محض ذرائع اعمال اور وسائل حیات کے علم تک محدود ہے۔ لیکن قرآن جسے حکمت کہتا ہے وہ مقاصد حیات کا علم ہے۔ اگر حکمت کی جدوجہد مقاصد حیات تک نہ پہنچ سکے اور انسانی زندگی کے نصب العین کو واضح نہ کر سکے تو وہ ادھور سی رہ جاتی ہے، اور بعض اوقات ادھورا علم جہالت سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطوں شو اگر میانہ گزینی سراب و نشہ لپی است
قرآن کریم کی تعلیم کی اساس توحید ہے۔ یعنی حیات و کائنات کا سرچشمہ وجود اور مصدرِ حقیقی ایک ہی ذات ہے۔ فلسفی اور سائنس دان مظاہر وجود میں علت و معلول سبب و اثر کے رابطے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ عام زبان میں بھی کسی چیز یا کسی واقعہ کو جاننے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ انسانی عقل اس کو کسی قاعدے کسی قانون کے تحت میں سے آئی ہے۔ قانون کے معنی تغیر میں ثبات کی تلاش ہے۔ عالم ظاہر و باطن میں ہر مظہر ہر وقت تغیر پذیر رہتا ہے۔ باوی نظر میں تمام ہستی تغیر پذیر معلوم ہوتی ہے۔ کثرت ظاہر ہے اور وحدت پنہاں۔ جب انسان متغیر حوادث کی کثرت میں کسی آئین کو تلاش کر لیتا ہے تو کثرت اور تغیر میں ثبات اور وحدت کا پہلو نمایاں ہو جاتا ہے۔ حکمت کی تلاش میں

انسان جزئیات کو کلیات میں پروتا چلا جاتا ہے۔ پھر کئی کلیات کو کسی ایک کلیہ کے تحت میں سے آتا ہے۔ عقل و فہم کی ترقی سے کلیات کی تعداد اوپر چڑھتے چڑھتے کم ہوتی جاتی ہے۔ نباتات میں ہر اکٹے والی چیز اپنا مخصوص رنگ روپ رکھتی ہے اور اس کے نشوونما کا قانون بھی مخصوص ہوتا ہے۔ لیکن ماہر نباتات اس تنوع اور کثرت کو انواع کے تحت میں لاکر مخصوص انواع کے مخصوص قوانین تلاش کرتا ہے۔ اسی طرح حیوانات کا ماہر ان کے اقسام بناتا ہے اور ہر قسم کا ایک نام تجویز کرتا ہے۔ یہ نام کسی ایک فرد کا نام نہیں ہوتا بلکہ ایک نوع کا نام ہوتا ہے جس کے اندر لا تعداد افراد کچھ صفات کی مماثلت کی بدولت علم کے لحاظ سے ایک لڑی میں پروئے جاتے ہیں۔ قرآن حکیم میں بھی علم کا یہی مفہوم ہے۔ آدم کے قصے میں تمام ملائکہ پر انسان کی فضیلت اسی بنا پر ثابت ہوئی کہ اس کو تمام اشیاء کے نام معلوم ہو گئے۔ بے شمار درختوں کو اس نے درخت کہا، طرح طرح کے چھوٹے بڑے پتھروں کو اس نے پتھر کہا۔ اسی کا نام عقل اور علم ہے۔ اور اسی راستے پر ترقی کرتے چلے جانا حکمت کی ترقی ہے۔ قرآن کا نظریہ اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ یہ لاقتنا ہی کثرت اور تغیرات کی کائنات ایک وحدت سے سرزد ہوئی ہے اور اس کو سمجھنے کا بھی لازمی طریقہ یہ ہے کہ انسان کمیں بھی کثرت کو کثرت محض نہ سمجھے بلکہ ہر قدم پر اس کو چھوٹی یا بڑی وحدتوں کی طرف لوٹا جائے یہاں تک کہ وہ ایک وحدت کلی تک پہنچ جائے جو اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی ہے اور باطن بھی۔ تمام علمی اور عملی کوششوں کا منہتی بھی خدا ہے، اور تمام حکمت کا مقصد بھی ہستی کی وحدت کا فہم ہے۔ قرآن جو خالص توحید کی تعلیم دیتا ہے وہ درحقیقت معرفت کائنات کا درس ہے۔ علم کی زبان میں جسے آئین یا قانون کہتے ہیں قرآن کی زبان میں اس کو سنت اللہ کہا گیا ہے جس کے متعلق کسی جگہ دہرایا گیا ہے کہ تم اس میں کوئی تغیر یا تلون نہ پاؤ گے۔ خلاق کائنات اور مادی وجود کی مشیت کچھ ثابت و قائم اصول رکھتی ہے۔ خدا کا پابنا

اور اس کا ارادہ انسانی خواہش اور ارادے کی طرح نہیں ہو گئی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ آئین حیات کو قائم و دائم رکھنا خدا کا ایک وعدہ ہے اور خدا وعدہ خلافی نہیں کرتا ان اللہ لا یخلف المیعاد۔ سائنس میں کسی نظریہ کی صداقت اسی سے جانچی جاتی ہے کہ اس کے مطابق جو پیش گوئی یا پیش بینی کی جاسے، بعد میں آئے واسطے حوادث و مظاہر اس کی تصدیق کریں۔ گویا سائنس کا مدار بھی ان اللہ لا یخلف المیعاد ہی پر ہے۔ انسان کی فطرت ہو یا کائنات کے کسی شعبہ کی فطرت سب کے متعلق قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ لا یتبدیل الخلق اللہ قرآن کے نزدیک اسی کو ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے کا نام دین ہے اور اسی کی معرفت حکمت ہے۔ دنیا کے کسی مذہبی صحیفہ میں یہ تعلیم اس وضاحت کے ساتھ نہیں ملتی۔ دین کی ماہیت کو قرآن ہی نے ہمیشہ کے لیے واضح کیا ہے اور عقل و حکمت کے ساتھ اس کا لزوم بتایا ہے،

فطرۃ اللہ الّتی فطر الناس علیہا
لا تبدل الخلق اللہ ، ذالک
دین القیم

اللہ کی اس فطرت کو دیکھو جس پر اس نے
انسانوں کو پیدا کیا ہے قوانین خلق میں کوئی
تبدیلی نہیں۔ یہی ہے دین قیم۔

قرآن نے پہلے انبیاء کی نسبت بھی یہ فرمایا ہے کہ وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ احکام الہی کے ساتھ ساتھ لوگوں کو عقائد و اعمال کے فطری علل و اسباب اور نتائج سے بھی آگاہ کرتے تھے۔ محض حکم ہی نہیں سناتے تھے بلکہ اس کی حکمت بھی واضح کرتے تھے۔ پہلے انبیاء کے احکام زمان و مکان اور مخصوص مزاج اقوام کے مطابق تھے۔ اسی لیے جو حکمت وہ پیش کرتے تھے وہ بھی محدود و مخصوص تھی۔ کلمہ الناس علی قدر عقولہم نبوت اور حکمت دونوں کے لیے لازمی قاعدہ ہے۔

آخر میں جب ابدی حقائق پیش کرتے والا عالمگیر دین آیا تو اس میں حکمت کا پہلو بھی تمام موجودات اور تمام عالم انسانی پر محیط ہو گیا۔ قرآن کے نزول کے بعد

وین اور حکمت کے دائرے الگ الگ نہیں رہے۔ بعض قسم کے فلسفوں اور
 دین میں تو تضاد ہو سکتا ہے، لیکن مظاہر فطرت میں آئین کی جستجو اور دین اسلام
 میں یا بھی تضاد و تخالّف کا کوئی امکان نہیں۔ قرآن مختلف سائنسوں کے جزئی اور
 مخصوص معلومات کی تعلیم نہیں دیتا۔ نہ وہ فلکیات کی کتاب ہے اور نہ طبیعیات و
 کیمیا و ریاضی کی کتاب، لیکن تمام سائنس کی بنیادوں کو قرآن سنہ استوار کر دیا ہے
 سائنس کی تمام اساسیں یہی ہے کہ مظاہر متغیر ہیں لیکن ان کے قوانین تغیر پذیر
 نہیں۔ کسی شعبہ کائنات کا قانون کبھی کبھی اور کبھی کبھی جو جائے تو یہ کائنات،
 کائنات نہ رہ سکے۔ جمادات، نباتات، حیوانات، اجرام فلکیہ بے آئینی سے
 قائم نہ رہ سکیں۔ بلکہ قیام کا تو کیا سوال ان کا وجود ہی سرے سے ناممکن ہو جائے۔
 جو چیز عدم سے وجود میں آتی ہے وہ ایک خاص انداز سے ظہور پذیر ہوتی ہے
 قرآن کہتا ہے کہ خدا کی قدرت اور اس کے خزانے لانتناہی ہیں۔ لیکن جو کچھ
 معرّض وجود میں آتا ہے وہ ایک خاص انداز سے اور تناسب کے ساتھ آتا ہے:
 انا کل شیء خلقتہ بقدر (۴۹:۵۴) ہم نے ہر چیز کو ایک خاص انداز سے
 پیدا کیا ہے۔

ہستی کی اسی ماہیت کو قرآن میران بھی کہتا ہے:

اللہ الذی انزل المکتب بالحق و اللہ سنہ ٹھیک ٹھیک کتاب بھی اتاری

اور میران بھی۔

المیزان ... (۱۵:۹۲)

قدیم زمانے میں اکثر مذاہب کے متقدّمین سنہ عقیدہ قائم کر لیا تھا کہ ہر قسم
 کی سائنس کے نظریات ان کے مذہبی صحیفے میں از روئے وحی درج ہیں، اس
 لیے کسی سائنس دان نے شجر و حجر اور شمس و قمر کے متعلق جو کچھ کہا اس کو اس نظر
 سے دیکھا گیا کہ وہ مذہبی صحیفہ میں بیان کردہ تعلیم کے مطابق ہے یا مخالف
 فلکیات کے تعلیم کی قیاساً است کو دین کا جزو سمجھ لیا تھا۔ جب جدید تجرباتی
 سائنس نے ان کی تائید نہ کی تو گیلیلو جیسے محقق کو قابلی تغیر قرار دیا۔

یورپ میں مذہب اور سائنس کی کشاکش نے ضحاک انسان کو بہت مضطرب کیا اور یہ اضطراب اب بھی باقی ہے۔ سائنس کا آغاز مسلمانوں کی تجرباتی تحقیقات سے ہوا لیکن کسی مسلمان مفکر کی ان کوششوں کو ملعون اور مردود قرار نہیں دیا گیا۔ فطرت کے مظاہر میں آزادانہ طور پر تحقیق و تدقیق سے آئین تلاش کرنا ایک بین حکیم قرآنی تھا۔ لہذا دین اور سائنس کی باہمی جنگ نہ اسلام کی تاریخ میں پہلے نظر آتی ہے اور نہ اب اس کا امکان ہے سو اس کے کہ اسلام اور قرآن ایسے جاہد اور کوتاہ بین فقیہوں اور مفسروں کے ہاتھ میں آجائے جو مغرب کے عیسائیوں کی طرح سائنس کے جزئیات کو بھی قرآن و حدیث میں تلاش کرنے کی سعی لاحق حاصل کریں۔ قرآن نے حکیمانہ زاویہ نگاہ پیدا کیا ہے جس سے ابد الابد تک حکمت و معرفت کی راہیں کھل گئی ہیں۔ قرآن میں اگر شجر و جگر یا شمس و قمر یا برق و باران کسی بیان میں ملے ہیں تو اس کا مقصد کسی طبعی سائنس کے جزئی نظریات کو پیش کرنا نہیں بلکہ فصاحت و بلاغت اور اسلوب بیان سے مقصود حیات کو واضح کرنا ہے۔ تشبیہات و تمثیلات کسی سائنس کے آئین و قوانین نہیں ہوتے۔ فطرت کے مظاہر کی بہت سی چیزیں زبان کے عام محاورات میں داخل ہو جاتی ہیں اور فصاحت کا تقاضا ہی ہوتا ہے کہ ان کو ولی کش انداز میں اپنے بیان میں سمجھ کر لکھا جائے۔ روحانی حقائق کو تشبیہات اور تشبیہات میں پیش کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خالی منطقی استدلالی عام انسانی طیارے کے لیے اتنا ولی نشین اور اثر آفریں نہیں ہوتا جتنا کہ مثال اور تشبیہ۔ قرآن کہتا ہے کہ تشبیہ تمثیل کی ماہیت فقط راسخ العلم لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ کوتاہ نظر اور فقہ انگیز لوگ الفاظ و صورت میں الجھ جاتے ہیں۔ قرآن نے نہایت حکیمانہ انداز میں محکمات کو متشابہات سے الگ کر دیا ہے۔ دین کا لازمی جزو محکمات ہیں یعنی وہ محکم حقائق جو فطرت کے مطابق ہونے کی وجہ سے اٹل ہیں۔ خود جنت کے نہایت ولی کش بیانات کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ جنت کی مثال ایسی ہے

جیسے کہ کوئی باغ ہو :

مثل الجنة التي وعد المتقون جس جنت کا متقیوں سے وعدہ کیا گیا ہے اسی
فیرھا انھر من ماء غیرا من کی مثال ایسی ہے کہ جیسے اس نے خراب ہونے
..... (۴۷ : ۱۵) واسطہ پانی کی نہریں ہوں

اسی طرح دوزخ کے متعلق فرمادیا کہ اس کے شعلے دلوں میں سے اٹھتے ہیں تاکہ سمجھنے
و اسے سمجھ جائیں کہ وہ لکڑی یا کوئلہ جلانے والی بھٹی نہیں ہے :
ناد الله الموقدۃ التي علی الافئدة اللہ کی وہ سگائی ہوئی آگ جو دلوں پر
سے اٹھتی ہے۔ (۷۹ : ۱۰۵)

قرآن میں بعض جگہ فقط احکام ملتے ہیں جن کے ساتھ ہی ان کی حکمت کو بیان
نہیں کیا جاتا لیکن کہیں کہیں آئین سازی کے اصول کو بھی بیان کر دیا ہے۔ مثلاً
خمر اب اور قمار بازی کے متعلق نہایت اچھا استقرار کیا ہے اور ان اعمالِ شیطانیہ
کی ممانعت کا سبب بتا دیا ہے۔ کوئی قاعدہ یا قانون ایسا نہیں جو ہر حالت میں
ہر شخص کو نفع یا نقصان پہنچائے۔ کوئی بھی طریق کار ہو اس میں بعض لوگوں کو
بعض حالات میں کچھ فائدہ پہنچ جائے گا اور بعض کو نقصان۔ انسانی فطرت اور
معاشرت کی ساخت ہی ایسی ہے کہ ایسا ہونا لازمی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان
اعمال سے بعض اوقات بعض لوگوں کو کچھ فائدے بھی پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن تمام
انسانی معاشرت اور نفسیات پر پھیلا کر دیکھو اور اجتماعی نقطہ نظر سے ان کا جائزہ
لو تو ان کے نقصانات ان کے منافع سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ قانون
اکثریت کی بنا پر بنتا ہے۔ اس میں چند افراد کا نفع یا ضرر نہیں دیکھا جاتا بلکہ
قرآنی سننے یہ بتا دیا کہ قانون کی بنا افادیت عامہ ہے۔

انگلستان کے اکثر قوانین ہنٹن اور مل کے زمانے تک نہایت مہمل اور
عامہ خلاقی کو نقصان پہنچانے والے تھے۔ ان مضر قوانین کا ماخذ کچھ مذہبی تھا
اور کچھ انگلستان کا قدیم روایتی قانون۔ ان قوانین میں نہ کوئی عدل نظر آتا تھا

اور نہ کوئی حکمت۔ اس لیے ان مصلحین اور مفکرین نے شدید جدوجہد کی کہ حکومت کو اس پر آمادہ کیا جائے کہ قانون کی بنا افادیت پر ہونی چاہیے۔ قانون انسان کے لیے بنایا گیا ہے انسان ہر فرد سو وہ اور ہممل قانون کی پابندی کے لیے نہیں بنا۔ رفتہ رفتہ اس جدوجہد کا یہ اثر ہوا کہ قوم کے اکابر نے حکیمانہ اور عادلانہ انداز میں سوچنا شروع کیا اور لغو قوانین کو منسوخ کر دیا۔ اگرچہ اب بھی شادی اور طلاق اور وراثت کے متعلق کئی لغو قوانین موجود ہیں جو اصلاح طلب ہیں۔ انگلستان کے قدیم قانون وراثت میں وصیت کرنے والا ہر وارث کو مطلقاً محروم کر سکتا تھا۔ اور ہر نکاح کرنے والی عورت کی تمام جائیداد اور تمام سرمایہ شوہر کے نام منتقل ہو جاتا تھا۔ عورت کی انفرادی حریت اور شخصیت بالکل سوخت ہو جاتی تھی۔ قرآنی احکام اور حکمت سے ان قوانین کا مقابلہ کر کے دیکھیے تو واضح ہو جائے گا کہ قرآن نے نوع انسان پر کتنا احسان کیا ہے اور کمزوروں کی کس قدر حمایت کی ہے۔

قرآن نے انسان کو حکمت پسند بنانے کے لیے ایک اور اہم قدم اٹھایا اسلام سے قبل کے تمام مذاہب نے اپنی بنیاد معجزات یا خوارق عادت پر قائم کی تھی اور انسانوں کی یہ عادت راسخ ہو گئی تھی کہ ہر نبی سے یہ تقاضا کیا جائے کہ وہ اپنی صداقت کے ثبوت میں کچھ معجزات دکھائے۔ یہ مطالبہ کفار قریش بار بار رسول کریم سے کرتے تھے۔ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ تم سے پہلوں میں معجزات نے کونسا ایمان پیدا کیا کہ اب چروہی بگڑ رہی تھی اسے ساتھ دہرایا جائے۔ خوارق عادت کے مطالبے کے جواب میں قرآن بار بار مناظر فطرت کو پیش کرتا ہے اور فطرت کے مشاہدے سے فاطر فطرت پر ایمان لانے کی تلقین کرتا ہے۔ تمہارے سامنے جو کچھ ہو رہا ہے خواہ وہ مٹی سے گھسائے رنگارنگ اور شمار گونا گوں کی پیداوار ہو یا اجرام فلکیہ کا حساب سے گردش کرنا، سب معجزات ہی ہیں۔ ان معجزوں میں نہیں کہ وہ خوارق عادت

ہیں۔ بلکہ خدا کی رحمت اور اس کی حکمت کے خیر متبادل مظاہر ہیں۔ انسان ایک طرف ان کی آفرینش سے عاجز ہے کہ ایک مکھی کا پر بھی نہیں بنا سکتا۔ دوسری طرف عجز یہ ہے کہ ایک پتہ اور ایک درے کی ماہیت کو بھی کماحقہ نہیں سمجھ سکتا۔ کوئی واقعہ انسان کے لیے خرق عادت ہو تو خدا کے لیے تو خرق عادت نہیں ہو سکتا کیونکہ خدا اکتا ہے کہ میں اپنی عادت یا سنت میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ جس کو انسان مجرہ سمجھتا ہے وہ بھی خدا کے کسی آئین کے ماتحت ظہور میں آتا ہے۔ بقول عارفِ رومیؒ۔

ہست بر اسباب اسبابے وگر

مردِ حکیم پر جس قدر ہستی کے آئین واضح ہوتے جاتے ہیں اسی قدر وہ پُر اسرار ہستی جاتی ہے اس لیے کہ ہر وجود کے اندر اور باہر لائقا ہی ہے۔ اس مضمون کا عرفی کا ایک نہایت حکیمانہ شعر ہے :

ہر کس نہ مشائخہ راز است وگر نہ ایں ماہمہ راز است کہ معلوم عوام است
روس کے مشہور ادیب اور عارفِ مالطائی نے بھی کیا خوب کہا ہے کہ کلیبیائی
عیسائیت باری تعالیٰ کے ثبوت میں یہ معجزہ پیش کرتی ہے کہ مسیحؑ بخراب
کے پیدا ہوا مگر میں تو خدا کا اس مسلسل معجزے کی وجہ سے قائل ہوں کہ مال
اور پاپ دونوں سے کس مجیر العقول طریقے سے ہر روز نئے انسان معرض وجود
میں آتے ہیں۔ دیکھیے ایک عیسائی عارف و حکیم کیسے اپنی بصیرت سے وہی
بات کہہ رہا ہے جو تیرہ سو برس قبل قرآن سننے لگی تھی کہ خدا کو خرق عادت میں
مت ڈھونڈو بلکہ اس کی قائم کردہ سنت اور عادت میں تلاش کرو۔ رسولِ کریمؐ
کے مستند سوارخ میں کوئی صحابی ایسا نظر نہیں آتا جو کسی خرق عادت یا معجزے
کی وجہ سے خدا اور رسولؐ پر ایمان لایا ہو۔ جو کوئی بھی ایمان لایا وہ رسولِ کریمؐ
کی سیرت، ان کی راست بازی اور ان کی تعلیمات کی خوبیوں سے متاثر ہو کر
جاں نثاروں کے گروہ میں شریک ہوا۔ بعض صحابیوں نے بعض مواقع پر

ایسی باتیں دیکھیں جو عالم اسباب کے محدود علم میں سمجھنے ہوتے ان کے لیے
جہرت انگیز تھیں لیکن ان کے ایمان لانے کا موجب نہ تھیں۔ قرآن نے فیصلہ
کر دیا کہ جو کوئی بھی ایمان کے نور سے منور ہونا چاہے وہ اسلامی تعلیمات کی خوبی
کو نہر کو کر اسلام میں داخل ہو۔ اسلام نے دین کا رخ معجزات سے فطرت عامہ
کی طرف اور خوارق عادت سے حکمت طبعی کی طرف پھیر دیا۔ یہ نوع انسان
کے ارتقا میں ایک بہت اہم قدم تھا۔

کوئی تین سال قبل میں نے امریکہ میں ایک یونیورسٹی میں اسلام کے بنیادی
عقائد پر ایک لیکچر دیا اور بتایا کہ قرآنی وحی میں فطرت اور حکمت کا کیا تصور ہے۔
اس کے بعد یونیورسٹی کے پریذیڈنٹ ڈاکٹر مرفی نے مجھ سے کہا کاش کہ ہمارے
ماں بھی دین کا یہ تصور ہوتا تاکہ ہم سائنس اور مذہب کی اس شدید کشاکش سے
بچ جاتے جس نے ہمارے نفوس اور عقائد میں ایک پیکار پیدا کر رکھی ہے۔ دین
میں ہم خوارق عادت کو اساس قرار دیتے ہیں اور باقی تمام سائنس اور دیگر تعلیم
میں فطرت کی آواز کو تحقیق کا درس دیتے ہیں۔

اب ایک اہم سوال کا جواب باقی رہ جاتا ہے کہ جب خدا کی کتاب، کتاب
حکمت ہے تو قرآن کتاب کے علاوہ حکمت کا کیوں ذکر کرتا ہے۔ نبی کریم کو
حکم ہے کہ تم لوگوں کو اپنے رب کی طرف بلاؤ۔ خدا اس کے تین طریقے بتاتا ہے
ایک حکمت، دوسرا موعظت، تیسرا مباحثہ، مناظرہ یا مجادلہ۔

ادع الی سبیل ربک بالحکمة
والموعظة الحسنة وجاهد لهم
بالقیل ہی احسن ط..... (۲۵: ۱۶) سے مباحثہ کرو۔

اس میں قرآن کا مقصد انسانوں کی تین قسمیں بتاتا ہے اور ہر قسم کو دعوت
دینے کا طریقہ الگ ہے۔ بعض انسان، اگرچہ ان کی تعداد بہت قلیل ہے،
حکمت پسند ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے اگر کوئی عقیدہ یا طریق عمل پیش کیا

جائے تو وہ اس کے علل و اسباب کو جانتا چاہتے ہیں، اور پوچھتے ہیں کہ اس بات پر کیوں یقین کیا جاتے یا اس عمل میں جس کی تعلیق کی جاتی ہے کیا خوبی ہے اور جس عمل سے روکا جاتا ہے اس میں کیا برائی ہے۔ جب تک کسی علم کی علت ان کی سمجھ میں نہ آئے وہ اس پر عمل کرنا گوارا نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ بس یہ خدا کا حکم ہے۔ حکمت پسند شخص جب تک حکم کی ضرورت اور اس کے نتائج سے آگاہ نہ ہو فرماں برداری پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ عربوں میں علوم و فنون نہ تھے اور کتابی علم نہ تھا لیکن ان میں ایک تعداد ایسے انسانوں کی تھی جن میں غیر معمولی خداداد ذہانت تھی۔ اگر یہ فطری صلاحیت موجود نہ ہوتی تو وہ بعد میں نظم و نسق حکومت اور تعمیر و اصلاح ملت کے لیے ایسے حیرت انگیز کام نہ کر سکتے جن کی بدولت ایک عاقلانہ معاشرہ اور عظیم الشان تہذیب تمدن قائم ہوا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اسلام کے احکام کو معقول سمجھ کر اس دین میں داخل ہوئے۔ افسوس ہے کہ موجودہ دور انحطاط میں ایسے خود ساختہ مادیان دین پائے جاتے ہیں کہ جب ان سے شریعت کے کسی حکم کی علت دریافت کی جائے تو وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ دین کے احکام میں علت تلاش کرنا ضروری نہیں اور دین کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہر حکم پر بے چون و چرا ایمان لایا جائے۔ عصر حاضر عقلیت اور حکمت کا دور ہے۔ جہلا کو تو بے سمجھے دین کی پابندی کی تعلیق کر سکتے ہیں لیکن علوم سے بہرہ ور لوگ جنہیں سوچنے کی عادت ہے وہ ایسا جواب یا کر دین کی ضرورت ہی پر شک کر سکتے ہیں۔ اب تعلیم یافتہ طبقے کو حکمت ہی کے راستے سے دین کا قائل کیا جاسکتا ہے لیکن بہت سے مدعیان دین خود حکمت کے جوہر سے محروم ہیں۔

نبی کریمؐ کو ایک دوسرے گروہ سے دوسرا طریقہ پرستنے کو کہا گیا۔ یہ طبقہ وہ ہے جس میں حکمت طبی کا عنصر کم ہوتا ہے۔ اس طبقے کے لیے غلط و پسند و نصائح اصلاح سیرت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ حکمت پسند طبقہ کے مقابلے میں اس گروہ

کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے لیکن موعظت بھی اسی واعظ کی موثر ہو سکتی ہے جس میں خود اخلاص ممل ہو۔ جس کا قول اس کے فعل کے مطابق ہو۔ ورنہ یقولون ما لا یفعلون کے گروہ کے متعلق وہ بات صحیح ہے جو حافظ علیہ السلام کہہ گئے ہیں :

واعظان کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بخلوت می روند آن کار و بگر می کنند
مشکل دارم ز دانشمند مختل باز پرس
توبہ فرمایاں چرا خود توبہ کمتر می کنند
یہ یقینی بات ہے کہ اسلام میں بہت سے لوگ نبی کریم کی موعظت کی وجہ سے داخل ہوئے۔ جو نصیحت کی جاتی تھی رسول کی زندگی خود اس کا ایک نمونہ ہوتی تھی کہتے ہیں کہ زندہ مثال کا اثر خالی نصیحت سے زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن نصیحت اور فاسخ کی زندگی اگر ایک دوسرے کا آئینہ ہوں تو اثر میں بہت گہرائی اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ رسول کی نصیحتیں اب بھی تقریر و تحریر میں صبح و شام و ہر آنی جاتی ہیں لیکن کسی کی زندگی پر ان کا کچھ اثر نہیں ہوتا اس لیے کہ کہنے داسے سکے کردار و گفتار میں ایک وسیع خلیج حائل ہوتی ہے۔

تیسرا گروہ مناظرہ بازوں کا ہے جو اپنی بات منوا سننے اور دوسرے کی بات کو رد کرنے پر تعلق ہوتے ہیں۔ یہ نہ حکمت پسند ہوتے ہیں اور نہ پسند پذیر۔ ہر مخلص مصلح کو ایسے لوگوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ کسی اہم دینی مسئلے پر بحث کرنے سے کوئی نبی کیسے انکار کر سکتا ہے۔ لیکن نبی کا کام یہ ہے کہ ہر طبقے کے لیے ایک اچھی مثال پیش کرے۔ نبی کو حکم دیا گیا کہ ان سے بحث کر لیکن خوبصورت طریقے سے۔ کسی مناظرے میں اخلاص و صداقت کو ہاتھ سے نہ دینا، دل آزار پیرایہ کا جواب مصلح اور نرمی سے دینا۔ خواہ مخواہ دوسرے کو گراسنے اور پراسنے کی کوشش نہ کرنا غیر معمولی صابر نفس کا کام ہے۔ اس کام کو ایک پاکیزہ نفس اور حکیمانہ مزاج رکھنے والا رحیم و کریم نبی ہی انجام دے سکتا ہے۔ عام انسانوں میں شاید ہی کوئی ایسا شخص دکھائی دے جو مذہبی بحث میں واقعی طالب حق ہو اور مذہب طریقے سے دوسرے

کی سنے اور اپنی ستائش، اور یہاں حریف یہ بات کہہ رہا ہو، اس کی صمیم قلب سے
 داد دے۔ رسول کریمؐ سنے جو لوگوں سے بحثیں کی ہیں اُن کو سامنے رکھ کر دیکھیے
 کہ ان کا انداز بحث سلجھا ہوا ہے۔ محض شخصی اور الزامی گفتگو کمین نہ سے گی۔
 کتاب و حکمت کے متعلق بعض فقہاء کا خیال ہے کہ کتاب سے مراد قرآن
 اور حکمت سے مراد سنتِ رسولؐ ہے۔ اس میں کسی قدر صداقت ضرور ہے،
 لیکن یہ بات ذرا وضاحت طلب ہے۔ سنتِ رسول کریمؐ کا عمل ہے جو قرآنی
 تعلیم کی عملی صورت ہے۔ خیالی بلند افکار نے دنیا میں کبھی انقلاب پیدا نہیں
 کیا جب تک کہ ان افکار کو عملی جامہ پہنانے والے دنیا کے سامنے نہ آئے۔
 اگر رسولؐ خود اپنے عمل میں قرآن مجسم نہ ہوتے تو محض خدا کی کتاب کوئی انقلاب
 پیدا نہ کر سکتی۔ دنیا میں اسلام کی بدولت جو اصلاحی انقلاب ہوا وہ قرآن اور
 سیرتِ محمدؐ نے مل کر پیدا کیا۔ قرآن پر عمل کر سنے سے زندگی کیا بن سکتی ہے
 اس کا مظاہرہ رسولؐ کے اسوہ حسنہ ہی سے ہوا۔ لیکن قرآن جب کتاب اور
 حکمت کہتا ہے تو اس میں حکمت محض سنت کے مرادف نہیں ہے۔ اگر یوں
 سمجھا جائے تو اس سے یہ ایک غلط نتیجہ نکلتا ہے کہ خود کتاب میں حکمت نہیں
 ہے۔ قرآن تو خدا کو حکیم اور اس نے آپؐ کو حکمت کی کتاب قرار دیتا ہے۔ صحیح معنی
 یہ ہوں گے کہ نبی خدا کی کتاب کو پیش کرتا ہے، اس کی آیات پڑھ کر سنا لیتا ہے۔
 مگر اسی پر اکتفا نہیں کرتا۔ اس کتاب کے اندر جو حکمت ہے اس کو سنے والوں
 پر واضح کرتا ہے۔ اگر وہ مخاطب پر کھول کر اس کی حکمت واضح نہ کرے تو شاید
 وہ حکمت یہاں رہ جائے۔ اس وقت دنیا میں ہر علم و فن میں مستند اساتذہ کی
 تصنیف کردہ کتابیں موجود ہیں۔ یونیورسٹیوں کے طالب علم ان کو خود سنے اور
 پڑھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اعلیٰ درجے کے پروفیسروں سے انھیں کتابوں
 کے پڑھنے کے بغیر چارہ نہیں۔ جن طالب علموں نے اعلیٰ درجے کے اساتذہ
 کے سامنے زانوئے تلمذ تہ نہیں کیا ان کے اندر محض اچھی کتابیں پڑھنے کے باوجود

ایک کمی رہ جاتی ہے۔ حکمت کتاب میں موجود ہوتی ہے لیکن استاذ کی توضیح اس کو اجاگر کرتی اور کتاب کے ہر گوشے کو منور کر دیتی ہے۔ شخص طب کی کتابیں پڑھنے سے کوئی طبیب حاذق نہیں بن سکتا جب تک کہ تجربہ کار اطباء سے اس سے کسب فیض نہ کیا ہو۔

کتاب و حکمت میں حکمت، قرآن حکیم ہی کی حکمت ہے جس کو بطون سے ظہور میں لانا اور حکم کو عمل کا جامہ پہنانا نبی کا وظیفہ ہے۔ میرا کہنا یہ ہے کہ حکمت کوئی ایسی سنت نہیں جو قرآن سے الگ ہو، یا اس میں کوئی اضافہ کرتی ہو۔ قرآن کے اندر کہیں احکام ہیں اور کہیں حکمت کے اصول ہیں۔ یہی حکمت کے اصول اصل دین ہیں، جو احکام کی اساس ہیں اور جن کی بنا پر متغیر حالات اور نئے ماحول میں نئے احکام کا ارتباط ہو سکتا ہے۔ خود رسول کریمؐ نے اپنی زندگی میں اور اس کے بعد خلفائے راشدین اور ان کے بعد ائمہ مجتہدین نے ایسا ہی کیا۔

(ثقافت، اپریل ۱۹۵۵ء)

اسلام اور آزادی فکر

اسلام نے عالم انسانی میں کئی نظریاتی اور عملی انقلابات پیدا کیے۔ لیکن اگر طالع اسلام کی محاصرہ بندیوں، تمدنوں اور مذاہب کا جائزہ لیا جائے تو یہ امر بلا خوف تردد یہ نمایاں ہو جاتا ہے کہ سب سے اہم انقلابی بات جو اسلام نے کی وہ آزادی ضمیر کی تدبیر اور اس پر عمل تھا۔ قرآن کریم میں انسان کی فطرت کے متعلق ایک اساسی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ ایک صاحب اختیار، مستحکم آدم کے عالم شہوت میں اسے پیشتر جہادی، بنیاتی اور حیوانی کائنات موجود تھی اور فرشتے بھی ابتدائے آفرینش سے نظم کائنات میں خدا سے خلاق کے نمائندے اور کارندے تھے۔ لیکن بلا کہ سمیت تمام مخلوقات کی کیفیت یہ تھی کہ ہر مخلوق از روئے فطرت اطاعت پر مجبور تھی، اس جبر سے وہ کوئی تنگی محسوس نہ کرتی تھی۔ ہر چیز اپنی فطرت کا تقاضا پورا کر رہی تھی، اور اپنی فطرت کا تقاضا پورا کر کے میں جس قسم کا جبر پایا جاتا ہے وہ مکروہ محسوس نہیں ہوتا۔ آدم کی آفرینش کے وقت خدا سے خلاق و حکیم نے ایک نیا تجربہ کرنا چاہا اور وہ یہ کہ ایک ایسی مخلوق کو پیدا کیا جائے جسے نیکی اور بدی دونوں کے راستے دکھائے جائیں اور اسے اختیار دیا جائے کہ ان راستوں میں سے جو چاہے اسے اختیار کرے، اسے از روئے وحی اور از روئے تجربہ یہ علم دیا جائے کہ ان متضاد راستوں پر چلنے کے نتائج کیا ہوں گے لیکن اس کے ارادوں پر کوئی جبر نہ ہو۔ اگر یہ مخلوق جسے احسن تقویم ہونے کے باوجود اختیار گناہ بھی دیا گیا ہے، اپنی مرغی سے وہ راستہ اختیار کرے جو مشیت الہی کے مطابق ہے تو وہ کائنات میں سب سے اعلیٰ اور اشرف ہو جائے اور اگر صلاحیتوں اور علم کے باوجود

وہ غلط راستے کو ترجیح دے تو وہ تمام موجودات کے مقابلے میں اوستے ہو کر اسفل السافلین بن جائے۔ کسی شاعر کا مشہور قطعہ ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ آدمی زادہ فرشتگی اور حیوانیت کی ایک عجیب معجون مرکب ہے۔ اس میں دونوں عناصر پائے جاتے ہیں۔ ملوثی میلان کو ترقی دے تو فرشتوں سے فائق ہو جائے اور حیوانیت کی طرف رجحان ہو تو کالانعام بل ہمداضل ہو کر تمام حیوانوں کے مقابلے میں زیادہ ذلیل اور گمراہ ہو جائے:

آدمی زادہ طرفہ معجونیت از فرستہ سرشتہ وز حیواں

گر کند میل ایں شود بد ازیں ور کند قصد آں شود بہ اذال

اس قطعے میں یہ مضمون مضمر ہے کہ ان دو عناصر کے علاوہ انسان کو ایک تیسرا ملک و ولایت کیا گیا ہے اختیار کہتے ہیں۔ اس کی بلندی اور پستی کا معیار اسی آزادی کے صحیح یا غلط استعمال پر ہے۔ آدم کے قصے میں اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ اس نے اس اختیار کے جوہر کا اولاً غلط استعمال کیا اور اس سے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ تمام دیگر مخلوقات سے جو مجبور اور مطیع ہیں، کوئی دوسری قسم کی مخلوق ہے۔ آزادی ہی کا عملی ثبوت نبیا ہونے سے انسانیت کا آغاز ہوتا ہے۔ خواہ ناخبر بہ کار انسان اول قدم میں ڈگمگا ہی کیوں نہ جائے۔ خدا نے دیکھا کہ مخلوقات کی اطاعت جبری میں وہ لطف نہیں جو اس بندے کی اطاعت میں ہے، اسے خلاف ورزی کا اختیار تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنی مرضی سے اطاعت کی، صراطِ مستقیم کو راہِ نجات سمجھا، اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کا ہم آہنگ بنا دیا اور اس اتحاد کی وجہ سے اس کو الوہیت کا وہ قرب حاصل ہوا جو جلیل القدر ملائکہ کو بھی نصیب نہ تھا۔ خدا نے کہا کہ اب ہم کائنات کو محض غلاموں کی بستی دیکھنا نہیں چاہتے۔ خدا خود آزاد ہے، اس لئے چاہا کہ وہ اب اپنی ہم آہنگ مخلوق پیدا کرے جو اختیار اور آزادی کے ساتھ اپنی خودی کو خدا کے سپرد کر دے اور اپنے تئیں 'من تو شدم تو من شدی'

کی معراج پر پہنچا سکے۔ قصہ آدم میں مہبوط و عروج کی داستان کے اندر اسلام کی تمام تعلیم کا جو ہر موجود ہے۔ اپنے اختیار سے ٹھوکر کھا کر سمجھا ہوا انسان رفتہ رفتہ نیابت الہی اور خلافتِ ارضی کے رستے تک پہنچ سکتا ہے اسی لیے اس دین نے سب سے زیادہ آزادیِ ضمیر، آزادیِ فکر اور آزادیِ عمل کو مذہب اور تہذیب کی بنیاد قرار دیا ہے۔ انسان صد راقیوں کے راستے ٹوٹنے والی مخلوق ہے اور اگر اس جستجو میں آزادی نہ ہو، اور غلطی کرنے کا امکان نہ ہو تو انسان اور جمادات میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے۔ دین سب سے پہلے نیکی کی تلقین کا نام ہے لیکن جو نیکی جبر سے پیدا کی جائے وہ اخلاقاً نیکی میں شمار نہیں ہوتی۔ ایسی جبری نیکی کے لیے کون کسی کو قابلِ ستائش اور مستحقِ اجر سمجھتا ہے، اور ایسے شخص کے دین کی کیا قیمت ہے جسے بزورِ شمشیر یا بخوفِ تحقیر و تشہیر کسی عقیدے کے اقرار پر مجبور کیا گیا ہو۔ اس جبر سے تو اس کی انسانیت کا جو ہر ہی ملیا میٹ ہو جائے گا۔ حالانکہ دین کا کام اس جوہر کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک مغربی مستشرق نے لکھا ہے کہ قرآن کی تعلیم میں سب سے زیادہ شاندار چیز لا الہ الا فی الدین کا اعلان ہے کہ دین کے معاملے میں کسی قسم کا جبر جائز نہیں۔ رسول کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کی زندگی اور اسلام کے قیام و استحکام کی خاطر ان کی جدوجہد میں ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی کہ کسی شخص کو بزورِ شمشیر قبولِ اسلام پر مجبور کیا گیا ہو۔ کفار سے جنگیں اس لیے نہیں لڑی گئیں کہ ان کو مغلوب کر کے بکیر مسلمان کیا جائے بلکہ ان جنگوں کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو آزادیِ ضمیر کے انسانی اور ایسا کی حق سے محروم کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے محض ان کے دین کی وجہ سے عرصہٴ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ از روئے قرآن قتال و جہاد صرف اسی گروہ کے خلاف ہوتا ہے بلکہ فرض ہے جو انسانوں کو آزادیِ ضمیر سے محروم کر کے ان کو اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے میں مزاحم ہو۔ قرآن کریمؐ نے اس کے متعلق نہایت وضاحت سے کہا ہے کہ اگر خدا البیضاء ظالم اور جابر قوموں کے

خلاف حریت کے علم پر داروں کو قتال و جہاد کے لیے کھڑا نہ کرتا تو دیر و کفشت کلیسا و مساجد دنیا کے صفحہ مہمتی سے مٹ جاتے۔ اس آیت کریمہ کے اندر جو وسعت مشرب اور تمام مذاہب کے لیے جو آزادی کا اعلان ہے اس پر غور کرو کہ خدا ہر ایسے گروہ کو تباہ کرنے کے لیے مجاہدین کو کھڑا کرتا ہے جو صرف اسلام ہی کی حفاظت کے لیے جان و مال کی بازی نہیں لگاتے بلکہ تمام مذاہب میں آزادی ضمیر کو کھینے والے جہاں بھی ابھریں ان کو مغلوب کرنا انسانی کا فرض ہے۔ اس آیت کریمہ میں مساجد کا ذکر اور تمام ادیان کے معبودوں کی حفاظت کے بعد کیا گیا ہے تاکہ مسلمان یہ نہ سمجھ لیں کہ فقط اپنے مذہب کے مسئلے میں ہی آزادی ضمیر کے لیے جہاد فرض ہے۔ اس تعلیم کا عملی نتیجہ یہ ہوا کہ جب اسلامی جماعت اور مملکت محفوظ و مصون ہو گئی تو ہر ملت کو آزادی ضمیر کا چارٹر عطا کر دیا گیا۔ عیسائیوں کو عطا کر دیا یہ چارٹر اب بھی اپنے اصل الفاظ کے ساتھ فرامین حضرت عمرؓ میں محفوظ ہے۔ یہ طریق فکر و عمل رسول کریمؐ کی مثال سے شروع ہوا کہ مدینے میں اپنے ورود مسعود کے ساتھ ہی وہاں کے یہود کو یہ چارٹر عطا کیا گیا کہ اگر تم قیام امن میں ہمارے ساتھ تعاون پر تو، تو تمہیں اپنے مذہب اور طریق زندگی کے متعلق تمام وہ حقوق حاصل ہوں گے جو مومنین کی جماعت کو حاصل ہیں۔ اس کے بعد جب یہود مدینہ سے اسلام اور مسلمانوں کی سیخ کنی میں عملی جہد و جہر شروع کر دی اور اسلام کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کا آغاز کیا تو ان کے خلاف جنگ کر کے ان کو مطیع کرنا پڑا۔ لیکن کسی یہودی کو بجز مسلمان نہیں کیا گیا۔

قرآن کریم میں مشاہدہ فطرت اور تفکر و تدبیر کی تلقین اس قدر تاکید کے ساتھ ملتی ہے کہ اس کی مثال اور مذہبی صحیفوں میں نایاب ہے۔ حیات و کائنات لا محدود ہیں، اور ان کے مظاہر کے ساتھ ان آئینوں اور قانونوں کا بھی کوئی شمار نہیں جو قرآن کی اصطلاح میں کلمات الہی کہلاتے ہیں، تمام مہند

اور ان سے بھی زیادہ قلمروم اگر لکھنے کی روشنائی بن جائیں تو یہ سب خشک اور ختم ہو جائیں، پیشتر اس کے کہ کلمات کا بیان ختم ہو۔ اس تلقین کے مطابق انسان کی تمام عمر اور اس کا ہر لمحہ انفس و آفاق کے آئین و قوانین کی جستجو میں صرف ہونا چاہیے۔ عبادت کا وسیع ترین مفہوم یہی تفکر ہے۔ اگر آزادی فکری نہ ہو تو یہ عبادت کیسے ادا ہو سکتی ہے۔ تفکر کی ماہیت ہی میں آزادی سے سوچنا داخل ہے۔ آزادی فکر سے اسلام اس لیے گہرا تا یا خوف زدہ نہیں ہوتا کہ اسے یہ یقین کامل ہے کہ فکر آزاد ضرور ہر ارفہ بھٹکنے کے باوجود بھی انسان کو زندگی کی صداقتوں سے آشنا کر سکتی ہے۔

مسلمانوں کی سلطنتوں میں شروع ہی سے غیر مسلم کثیر یا قلیل تعداد میں آباد رہے ہیں۔ کبھی کسی مسلمان حکمران نے ان کی آزادی ضمیر کو نہیں کھلا۔ مملکت سے وفاداری اور عامۃ المسلمین کے ساتھ دوش بدوش امن و امان کی زندگی بسر کرنے کے علاوہ اور کوئی تقاضا ان سے کبھی نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے بعض وسیع خطوں پر صدیوں کی حکمرانی کے باوجود مسلمان اقلیت میں رہے، اور آخر میں ان کو رداداری کی یہ سزا بھگتنی پڑی کہ جب غیر مسلموں کو سیاسی یا عسکری غلبہ حاصل ہوا تو ان احسان ناشتا سوں نے مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے میں کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا اور ان کو فقط دو متبادل صورتیں پیش کیں کہ اپنا دین بھجور بدلو اور یا ایک بی بی و دو گوش باہر ہو جاؤ۔

یہ تو اسلام کی تعلیم اور مسلمانوں کے رویہ کا ایک روشن پہلو ہے جس نے انسانی تہذیب میں ایک گہرا قدر عنصر کو داخل کیا، لیکن اس امر کا افسوس کے ساتھ ذکر کرنا پڑتا ہے کہ خلافت کے مملکت میں تبدیل ہونے کے بعد بعض سلاطین کی کج اندیشی اور مردِ ایم سے اسلام میں پیدا ہونے والے فرقوں نے اسلام کے اس سبق کو فراموش کر دیا۔ غیر مسلموں سے تو کوئی قرض نہ کیا کہ وہ اپنے افکار و عقائد میں ہر طرح آزاد رہیں لیکن مسلموں نے مسلموں کے ساتھ

رواداری کو بالکلے طاق رکھ دیا۔ مطلق العنان سلاطین نے سیاست کے معاملے میں عامۃ المسلمین کو بے دخل کر دیا اور مذہبی فرقوں میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے دوسروں کے لیے آزادی اذکار و گفتار کو ممنوع قرار دیا۔ چھوٹے چھوٹے فروعی اور فقہی اختلافات پر ایک دوسرے کی جان کے لاگو ہو گئے۔ کہیں شیعہ سنی کے جھگڑوں میں، کہیں جبر و اختیار کی بحث میں، کہیں ذات و صفات الہیہ یا خلق قرآن کے عقیدے کی بابت ناموافق رائے رکھنے والوں کے خلاف آمادہ آزار و پیکار ہو گئے۔ ذرا ذرا سی بات پر تکفیر کے حربے استعمال ہوئے لگے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان جو دنیا کو آزادی ضمیر کا پیام پہنچانے پر مامور ہوئے تھے، سب دنیا سے زیادہ متعصب شمار ہونے لگے۔ ملت اسلامیہ کے انحطاط کے اور بھی بہت سے اسباب ہیں۔ لیکن ایک بڑا سبب آزادی فکر کا فقدان ہے۔ مذہبی تعصب کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے۔ مشرقی تہذیب کا انداز یہ ہے کہ اس کے اندر ہر چیز دین کے احاطے میں آجاتی ہے۔ کھانا، پہنا، اٹھنا، بیٹھنا، علوم و فنون، طبیعیات، کیمیا، علم الافلاک، معیشت، سیاست، سب مسلمہ عقائد کی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور ان میں سے کسی چیز میں زاویہ نگاہ یا طریق فکر و عمل کا اختلاف ایک اساسی دینی اختلاف بن جاتا ہے۔ جس کے بعد دو مخالفوں کا مل بیٹھنا یا مل کر خدا کے سامنے سجدہ کرنا بھی حرام ہو جاتا ہے۔ ایسی ملتیں جاہلی، پسماندہ اور مغلوب ہو جاتی ہیں۔ عالم انسانی میں ترقی تحقیق سے ہوتی ہے اور جمود کو روانہ تقلید سے پیدا ہوتا ہے۔ جس زمانے میں مسلمان تہذیب و تمدن میں اپنی معاصر دنیا سے کوسوں آگے تھے، اس زمانے میں تحقیق تقلید پر غالب تھی۔ باقی دنیا کی پس ماندگی کی وجہ یہ تھی کہ اور کسی جگہ مذہب اور علوم و فنون کے بارے میں آزادی فکر نہ تھی۔ مغرب میں کلیسا کے استبداد نے مغربی زندگی کے ایک ہزار سال کو ازمنہ مظلمہ بنا دیا اور تجدید کلیسا کی تحریک کے بعد مذہبی جھگڑوں سے مغربی تہذیب کے پرستار اڑا دیے۔ اٹھارویں صدی میں اسسٹی تعصب کی

خاتمہ بر باد می کے خلاف زور و شور سے رد عمل شروع ہوا اور چونکہ سب تیار ہی مذہب کے نام پر ہوتی تھی اس لیے مصلوبین اس نتیجے پر پہنچے کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر دیا جائے۔ نہ رہے بالسن اور نہ بکے بالسرے۔ اسلام زندگی کے کسی شعبے کو مذہب سے الگ کرنے کا قائل نہیں ہے۔ لیکن اگر تنگ نظری، عدم رواداری اور تقلید محض میں لکیر کا فقیر بننے کا نام اسلام ہو جائے تو خطرہ یہ ہے کہ اصلاح پسند اور امن پسند لوگ اسلامی ملکوں میں بھی دین کو سیاست سے الگ کرنے کی فکر کرنے لگیں۔

استبداد خواہ سیاست میں پیدا ہوا اور خواہ دین میں وہ آزادی فکر کو ختم کر دیتا ہے۔ اور تاریخ عالم میں جا بجا ایسا ہوا ہے کہ سیاسی استبداد نے دینی استبداد کے ساتھ ایک ابلیس نہ سمجھوتہ کر کے انسانوں کو غلام بنایا ہے جب کسی قوم میں خود داری اور آزادی کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو اس دو گونہ استبداد کے خلاف جہاد کرنا لازم ہو جاتا ہے۔

روسی انداز کی اکثر اکیٹ اسی استبداد کے خلاف طور میں آئی جس میں عرصہ دراز سے دین اور سیاست کا کٹھ جوڑ تھا۔ اور جہاں راسیوٹین جیسے لوگ دین کی آڑ میں مملکت کی مشین پر قابض ہو جاتے تھے۔ اس کے خلاف ایسا زور و شور کیا رد عمل ہوا کہ ملی معیشت اور سیاست کے ساتھ ساتھ دین بھی سوخت ہو گیا، اور آزادی فکر کا یہ حال ہوا کہ عبادت کرنے کی تو آزادی ہے لیکن دینی عقائد کی تبلیغ کی اجازت نہیں۔ دین کی مخالفت میں ہر شخص کو کامل آزادی بلکہ حکومت کا عملی تعاون حاصل ہے لیکن دین کی حمایت میں کچھ کہنا یا کرنا ممنوع ہے۔ توحید ممنوع ہے لیکن الحاد آزاد ہے۔

اس انقلاب میں انسانوں کو ایک استبداد سے نجات ملی لیکن ایک دوسرے استبداد میں ان کا فکر و عمل پابند بن کر ہو گیا۔ کوئی حریت پسند انسان ایسی معاشرت میں ایک دن بھی آزادی کا سانس نہیں لے سکتا۔ افسوس ہے کہ ہر قسم کے استبداد

کے مقابلے میں ہم اسلام کو تو پیش کر سکتے ہیں لیکن موجودہ مسلمانوں کو پیش نہیں کر سکتے کیونکہ وہ خود حریت فکر و عمل کا سبق فراموش کر چکے ہیں۔ دین کے غلط جوش میں بعضوں کا یہ حال ہے کہ مذہبی تعصب میں اس کو روا رکھتے ہیں کہ مخالف عقیدہ رکھنے والوں کے گھروں اور ان کی عبادت گاہوں کو جلا دیا جائے۔ عارف رومی نے کہا خوب کہا ہے کہ ع

”خلق را از انبیا آزادی است“

کہ انبیا دنیا میں اسی لیے مبعوث ہوئے ہیں کہ وہ انسانوں کو تقلید اور غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرائیں اور سب کو محبت اور رواداری کا سبق پڑھائیں۔ لیکن ہر مذہب اپنے انحطاط کے دور میں متعصب ہو جاتا ہے، اور دین کا اصل منشا سوخت ہو جاتا ہے۔ رواداری اور آزادی فکر تمام اقدار حیات کی تولید ترقی کی ضامن ہیں۔ جہاں یہ آزادی سوخت ہوئی نہ اخلاق باقی رہتے ہیں اور نہ دین میں اصلاح نفوس کی صلاحیت رہتی ہے۔ علوم و فنون کی ترقی رک جاتی ہے۔ تقلید اور جمود زندگی کے تمام شعبوں پر چھا جاتے ہیں۔ تحقیق کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ملت اسلامیہ کا اس حیات تک ناممکن ہے جب تک کہ آزادی فکر، رواداری اور تحقیق تمام ملت کا شعار نہ بن جائے۔ حقیقی اسلام ہی تھا اور جس غیر مسلم قوم نے بھی ترقی کی ہے وہ اسی شعار کی بدولت کی ہے۔ بقول اقبال :

مسلم آئیں ہوا کا فرق تو ملے سحر و قہر

دلہا فتی، گھر ۱۹۵۵ء

اسلام میں مادی ترقی کا مفہوم

اسلام نے کائنات کے ارتقا میں ابتدائی مراحل از روئے قرآن کریم مادی ہی قرار دیے ہیں۔ کہیں افلاک کے متعلق ارشاد ہے کہ ابتدائی حالت میں بھی دھواں اور کہیں جدید سائنس کے (Nebular Hypothesis) معروضہ و خانی کی طرف صریح اشارہ ہے ان السموات والارض کا تداقاً ففلقنہما کہ ارض سماوات ابتدا میں ایک ملا جلا مخلوط مادہ تھا اور اجرام فلکیہ جن میں از روئے ہیئت ہماری زمین بھی شامل ہے بعد میں ایک دوسرے سے جدا اور منفرد طور پر منسلک ہوئے ہیں۔ پھر نباتی اور حیوانی زندگی کے متعلق طبیعی سائنس کا ایک نظریہ قرآن کریم میں موجود ہے جس پر ماہرین طبیعیات کو پہنچے ہوئے بہت عرصہ لگا کہ نباتی اور حیوانی زندگی، یعنی کسی قسم کی بائیولوجی کی زندگی، پانی کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اور پانی ہی اسی نباتی اور حیوانی زندگی کی اصل ہے۔ وجعلنا من الماء کل شیء حیوی میں نے ایک بڑے ماہر سائنس دان کے سامنے یہ دو آیتیں پڑھیں تو وہ ششدر رہ گیا اور کہنے لگا کہ تو بین عالم طبیعی کا مسلم نظریہ اب تمام سائنس دانوں کے نزدیک ہی ہے۔ خود مادہ میں کسی قسم کی جان ہے یا نہیں۔ اس کے متعلق قرآنی تعلیم یہ ہے کہ جان اور شعور کے مدارج میں اود مادی طبیعی عالم بھی مطلقاً بے جان بے شعور نہیں اگرچہ اس کی حیات اور اس کے شعور کا انداز انسان پوری طرح نہیں سمجھ سکتا۔

تمام زمین پر انسان، دنیا و مافیہا خدا کی تسبیح میں مشغول ہیں، یعنی مادی عالم کی بھی اپنی صلوٰۃ و تسبیح ہے۔ اسلامی حکم جن کا نظریہ کائنات یونانی فلسفہ کا دہین منت نہیں، مثلاً جلال الدین رومی، اُن کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ عالم عناصر طبیعی

بھی روحانی عالم ہے۔ ہم مادے کو مردہ سمجھتے ہیں، خدا کے نزدیک وہ ایک زندہ حقیقت ہے:

خاک دباؤ آب و آتش بندہ اند با من و تو مردہ، با حق زندہ اند
غالب کے ہاں بھی یہ نظر یہ ملتا ہے کہ درے سے درے سے کد آفتاب تک دل ہی
دل اور ارواح ہی ارواح ہیں۔ طوطی شعور جس طرف بھی رخ کرے اس کے سامنے کوئی
آئینہ دل ہی ہو گا۔

از ہر تابہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ طوطی کو شخص بہت سے مقابل ہے آئینہ
میر درد جو ایک حکیمانہ مزاج کا صوفی شاعر ہے، کہتا ہے کہ:

آہستہ سے چل مہیاں کسار ہر رنگ دکان شیشہ گر ہے
اسلام سے قبل کے نظریات کائنات جو بعض ادیان کا بھی جزو بن گئے تھے،
عالم مادی کو نظر حقارت سے دیکھتے تھے۔ کوئی کہتا تھا کہ عالم طبیعی محض فریب
ادراک یا مایا ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ وہ عدم ہے، جن میں وجود کو قبول کرنے کی کم و
بیش صلاحیت موجود ہے۔ لیکن فی نفسه اس کا کوئی وجود نہیں۔ یعنی مادی عالم
کو شیطانانی عالم کہتے تھے، اور یہ تعلیم دیتے تھے کہ مادہ ظلمت محض ہے، اور شیطان
اس ملامت ظلمت پر حکمران ہے۔ یا یہ کہتے تھے کہ مادی عالم زندان ارواح ہے
اور زندگی کا نصب العین اس قید خانے سے رہائی پانا ہے۔ طاہران لاہوتی
نفس عنصری میں مجوس ہو گئے ہیں۔ اجرام فلکیہ میں تو ان کو نہایت مکمل ریاضیاتی
نظم دکھائی دیتا تھا لیکن عالم خاک ماتحت افلاک میں زیادہ تر بد نظمی ہی پائی جاتی
ہے۔ اس قسم کے تمام فلسفے اور ادیان انسان کو حیات کش رہبانیت کی طرف
لے آئے۔ جسم چونکہ مادی عناصر سے مرکب ہے اس لیے اس کی تحریب کے
درپے ہو گئے۔ بیک وقت نفس کشی اور جسم کشی عین روحانی ریاضت اور قرب
الہی کا وسیلہ سمجھی جانے لگی۔ اسلام نے سکھایا کہ اعضائے جسمانی روح کے آلات
ہیں جو اس کو اس غرض سے عطا ہوئے ہیں کہ وہ ان کے ذریعے سے حصولِ حیر

کر سکے۔ ہر عضو کا ایک وظیفہ ہے، اور اس وظیفہ کا صحیح طور پر ادا کرنا اس کی تسبیح ہے۔ جسم کو تندرست اور پاک صاف رکھنا جزو دین قرار دیا گیا اور طہارت جسمانی عبادت ربانی کا جزو لاینفک بن گئی۔ غیر اسلامی مغرب میں رہبانیت سکے دین والوں کا یہ رویہ عمل رہا کہ غسل کرنا ایک قسم کا گناہ ہے۔ جسم میں جب جوئیں پڑ جاتی تھیں تو جوؤں کو وہ خدا کے روحانی موتی کہتے تھے، جس سے راہب کا پیراہن مرصع ہو جاتا ہے۔ ترک دنیا اور تخریب بدن کے بھیانک نظارے اب بھی بعض قسم کے سادھوؤں میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں ان کی بڑی کثرت اور شدت تھی۔ ہمارے دور کے سوانح میں لکھا ہے کہ وہ بھی ان غلط روایات و شعائر کے زیر اثر کچھ عرصہ تخریب جسم اور بدن آزاری میں مشغول ہوئے لیکن حقیقت کے منکشف ہونے پر اس کو گمراہی قرار دیا۔

قرآن سننے مادی عالم اور جسمانی زندگی کو تمام الزامات سے بری کر دیا، اور یہ تعلیم دی کہ مختلف عالموں میں خاک و غلک میں نبات و جماد و حیوان و انسان میں جو تقسیم ہے وہ قانون تدریج کے ماتحت ہے، فصلتا بعضکے علی بعض لیکن ان کے درمیان کوئی ناقابل عبور خلیج نہیں ہیں۔ حیات و کائنات تمام ایک مسلسل وجود ہے جس میں مدارج تو ہیں لیکن کہیں تباہی یا شکاف نہیں۔ نیچے سے اوپر تک مسلسل وجود کی کڑیاں ایک لامتناہی سلسلہ حیات میں منسلک ہیں۔ جس طرح تمام موجودات کا خالق ایک ہے، جس کی ذات میں کوئی تضاد نہیں، اسی طرح موجودات میں بھی تعاون اور ہم آہنگی ہے، تحالف نہیں۔ اسلام صرف خدا ہی کی وحدت کا قائل نہیں بلکہ اس سے مشتق موجودات کی وحدت کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ عالم کے کسی پہلو کو نظر حقارت سے نہ دیکھا جائے، کیونکہ رب فقط کسی ایک کا رب نہیں ہے بلکہ رب العالمین ہے۔ اسلام نے رہبانیت کو مذہب سے اور انسانی زندگی سے خارج کر دیا۔ اگرچہ غیر اسلامی اثرات سے بعض ہستیوں نے اس کو اختیار کیا۔ اسلام بار بار کہتا ہے کہ

فلاح عامہ کے لیے بے دریغ خرچ کرو، تو اس سے لازم آتا ہے کہ پہلے
جدوجہد سے اسبابِ حیات حاصل کرو اور اس فراوانی سے حاصل کرو کہ
دوسروں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اس لیے اگر فقر کے یہ معنی ہوں کہ انسان
کے پاس اپنے لیے ہی سامانِ حیات نہ ہو، تو ایسا فقر خیرات کیا کرے گا وہ
تو خود محتاج اور مسکین ہو گا۔ رسول کریمؐ نے فرمایا کہ ”مفلسی سے دونوں
جہانوں میں مستہ کا لا ہوتا ہے۔“ (الفقر سواد الوجه فی الدین)۔
اور پھر اس کی یوں تشریح فرمائی کہ مفلسی انسان کو کفر کے بہت قریب لے
آتی ہے۔ مفلس کے لیے ایمان کی سلامتی و شواہد ہو جاتی ہے۔ جو شخص بہت
کم کے کماٹے کا نہیں وہ لازماً اپنی خودداری کھو کر گدا کر ہو جائے گا اور لجا
لجا کر اور مہرہ سکیر سکیر کر دوسروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرتا ہے
گدا۔

رسول کریمؐ نے فرمایا کہ یوم الحساب میں سانکوں کے منہ پر گوشت نہیں
ہو گا۔ عالمِ مثال میں گداگر کی یہی صورت ہوتی ہے۔ جس فقر کی رسول کریمؐ نے
تعریف کی ہے وہ ایک بہت بلند اندازِ حیات ہے۔ وہ زندگی کی خود
اختیار کی ہوئی سادگی ہے۔ وہ فرائضِ حیات کو پورا کرتے ہوئے مادی
نفع و ضرر سے بے نیاز رہتا ہے۔ وہ اس اخلاق کا نام ہے کہ جب دوسروں
کی بنیادی ضرورتیں بھی پوری نہ ہو رہی ہوں تو کوئی صاحبِ دل آدمی اپنے
پاس اسبابِ تعیش کا ڈھیر نہ لگا تاہا ہے۔

جس شخص کے پاس ہائے طور پر مادی اسبابِ غراہم ہوں وہ دین اور
اخلاق کے معاملے میں مقابلتاً آسانی سے فرائض کو انجام دے سکتا اور
انسانی ہمدردی کا ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ ایک مفلس مومن نے رسول کریمؐ
سے شکایتاً یا کسی قدر تاسف سے کہا کہ غنی لوگ خیرات کرتے اور تو اس
کماٹے ہیں۔ ہم مفلس ایسا نہیں کر سکتے اسی لیے گھاسٹے میں رہتے ہیں۔

نبی رحیم و حکیم نے اس کی تسلی کے لیے فرمایا کہ تم اس صدقہ کی بجائے عبادت زیادہ کر لیا کرو۔ پھر سائل نے کہا کہ بعض امیر ایسے ہیں کہ خیرات بھی کر سکتے ہیں اور عبادت بھی کرتے ہیں۔ وہ پھر بھی ہم سے آگے آگے ہی رہیں گے۔ رسول کو حکیم نے فرمایا کہ پھر یہ فضل الہی ہے، یعنی ایسی صورت میں مساوات کی اور کیا تجویز کر سکتا ہوگا اسلامی تعلیم یہ ہے کہ رزق کو اپنی کوشش سے زمین کے اوپر بھی ڈھونڈو، اور پیدا کرو، اور جنایاں سے ارغن یعنی زمین کے چھپے ہوئے خزانوں میں سے بھی نکالو۔ خوب کماؤ اور دولت پیدا کرو۔ لیکن ظلم کے ساتھ نہیں، حدود الہی کو نظر انداز کر کے نہیں، بلکہ رحم اور عدل کے ساتھ اور اس کے بعد اس فراوانی کو نوع انسان کی فلاح کے لیے پھیلاؤ۔ خزانے کے سانپ بن کر نہ بیٹھ جاؤ۔ اس تعلیم کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان صدیوں تک دوسری معاصر قوموں کے مقابلے میں زیادہ خوش پوش تھے۔ زیادہ اچھے مکانوں میں رہتے تھے۔ اچھی سواریاں رکھتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ فراخ مکان اور تیز سواری خدا نے کریم کی خاص نعمتوں میں سے ہے جس کو حاصل ہو وہ بڑا خوش نصیب ہے۔

ایک مغربی مصنف نے لکھا ہے کہ بارھویں، تیرھویں صدی تک یہ حال تھا کہ اسلامی ممالک میں متوسط درجے کا مسلمان رہائش اور پوشش میں یورپ کے شہزادوں سے بھی بہتر رہتا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ جلد جلد کپڑے بدلتے کاروبار یورپ کے اعلیٰ طبقوں میں بھی نہ تھا، اور نہ مائتہ کبھی شاد و ناہور ہی ہوتا تھا۔ باغبانی کا فن مسلمان مغرب میں سے گئے اور یورپ میں بہت سے اعلیٰ درجے کے میوے مسلمانوں کے ذریعے سے وہاں پہنچے۔ ہر دولت مند ایک اچھا باغ بنانا جزو تہذیب و تمدن سمجھتا تھا۔ مسلمانوں نے فن تعمیر میں جو کارنامے نمایاں کیے، ان پر سے بعض اب بھی صفحہ روزگار پر موجود ہیں۔ ہر فن کاروں سے خراج تحسین حاصل کرتے اور ناظرین کے لیے فروغ نظر ہیں۔ مسلمانوں کی ترقی محض اخلاقی اور علمی ترقی نہ تھی۔ بہتر اخلاق اور بہتر عمل سے مادی

زندگی کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ایسا تدارکی سے صنعت اور تجارت میں ترقی ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے پہلی قوموں کی صنعتوں کو حاصل کیا اور پھر اپنی جدتوں سے ان کو چار چاند لگائے۔ چمڑے کی اعلیٰ قسم کی دباغی مسلمانوں نے اہل مغرب کو سکھائی۔ چنانچہ اب تک چمڑے کی ایک اعلیٰ اور ملائم قسم (Morrocco Leather) یعنی مراکش کی چمڑا کہلاتی ہے۔

کافہ مسلمانوں کے ذریعے سے یورپ میں پہنچا۔ اب مغرب کے مؤرخین اس کا اقرار کرتے ہیں کہ بحری سائنس کی ابتدا مسلمانوں نے کی جس کی طرف سے یونانی حکمت بالکل غافل رہی تھی۔ یورپ کی نشاۃ ثانیہ (Renaissance) بہت کچھ مسلمانوں کی رہنمائی پر منت تھی۔ اس کے متعلق علامہ اقبال نے کہا ہے کہ :

بجھ کے شمع ملت بیضا پریشاں کر گئی اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی
دور گر دوں میں نمونے سینکڑوں تہذیب کے بل کے نکلے ماورایام کی آغوش سے
اب کوئی پوچھے گا کہ عالم مادہ کی متعلق اسلام کا نظریہ بالکل صحیح، اور
حیات پرور اور مسلمانوں کی ابتدائی شش صد سالہ ترقی کی داستان بھی درست۔
لیکن اب ان کو کیا ہوا ہے، جہاں تک مادہ کی ترقی کا تعلق ہے سب طرف پستی
ہی پستی ہے۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان اقوام پس ماندہ اقوام کے
زمرے میں داخل ہیں۔ گزشتہ تین سو سالوں میں یورپ علوم و فنون اور مادہ کی
ترقی میں دن و دن ترقی اور رات بوجھ گئی ترقی کرتا ہوا کہاں سے کہاں نکلی گیا۔ مسلمان
اقوام کو کیا سانپ سونگھ گیا کہ یہ سوتے ہی رہے۔ مغربی قوموں میں صدیوں کے
جمود کے بعد مسلسل حرکت پیدا ہوتی رہی اور یہاں تمام حرکت جمود میں تبدیل
ہو گئی۔ ہمارا دریا سائے حیات ساحل کی طرح آسودہ ہو گیا اور دھاراں ساحل بڑھی
ہوئی طغیانی کی زو میں آتے گئے۔ ملت اسلامیہ کو متحرک کرنے والا اور
جمود کا دشمن اقبال کہتا ہے :

ساحل آسودہ گفت گرچہ بے زلیم بیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم
 موج ز خود رفته تیر خرامید گفت ہستم اگر میروم گر نروم نیستم
 مغرب کیسے آگے بڑھتا گیا؟ اور مسلمان کیسے پیچھے رہتے گئے اس کے اسباب
 کا تجزیہ بڑی وسیع تحقیق چاہتا ہے۔ فلسفہ تاریخ کا ایک محقق لکھتا ہے کہ
 قومیں ایک انداز حیات پر زندگی بسر کرتے ہوئے اور اپنے خاص افکار و جذبات
 سے تہذیب و تمدن کا ایک ڈھانچہ بناتے ہوئے کوئی چھ سو برس کے عرصے
 میں ٹھک جاتی ہیں۔ انداز حیات کی کچھ لکیریں پڑ جاتی ہیں اور زندگی ان لکیروں
 سے ادھر ادھر نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد انقلاب کی ضرورت ہوتی ہے،
 جو پہلے تمام ڈھانچے کو اگر انہی تعمیریں بنائے۔ مولانا روم کا مشہور شعر ہے کہ:

ہر بنائے کمنہ کا باداں کند

اول آل تعمیر اور اہل کند

ایک دوسرا شعر اس مضمون سے ملتا ہوا کسی اور استاد کا ہے جس پر اقبال
 نے ایک تصنیفی نظم بھی لکھی ہے:

مغال کہ دانہ انگور آب سے سازند

ستارہ سے شکند آفتاب سے سازند

بعض مورخوں کا خیال ہے کہ یورپ تاتار کے بعد مسلمانوں کی تہذیبی و تمدنی
 اور علمی و فنی ترقی رک گئی، ان کے کتب خانے اور رصد گاہیں سپرد آتش ہو گئیں
 علوم و فنون کے حاصل، امصار و دیار تباہ ہو گئے اور اہل علم نابود ہو گئے۔ اس
 کے بعد ترکوں نے مسلمان ہو کر سیاسی طاقت کو حاصل کر لی لیکن علوم میں اضافہ
 نہ کر سکے۔ دوسری قومیں مسلمانوں سے زیادہ اسلامی ذراویہ نگاہ پیدا کرتی گئیں،
 اور قرآنی پیش گوئی کے مطابق وراثت ارض ہو گئیں۔ بقول اقبال:

مسلم آئیں ہوا کا فر تو سٹے سحر و تصور

اب یہ حال ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی تعلیم کی عملی صورت بھی دوسروں سے کھینچی پڑتی

ہے۔ قرآن نے تو کہہ دیا تھا کہ :

تلك الايام نزل اولها بين الناس

خدا کے نزدیک کوئی قوم اذلی اور ابدی طور پر محض الفاظ اور عقائد کو دہرانے سے چھیتی قوم اور نجات یافتہ قوم نہیں ہو سکتی۔ اسلام کو قائم کرنے والے وہ تھے جن کے متعلق فرمایا: کنتہ خیر امتہ اخر جت للناس۔ اب مسلمانوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ خیر امتہ میں وہ خود بھی شامل ہیں، خواہ ان کے اعمال کچھ بھی ہوں۔ یہ خود فریبی ہے جس میں اہل کتاب اور دیگر ملتیں اسلام سے قبل مبتلا تھیں۔ اسلام ہمہ گیر ارتقائے انسانی پابستہ ہے، اور مادی ترقی بھی اس ہمہ گیر ترقی کا ایک لازمی پہلو ہے۔

(ثقافت، اکتوبر ۱۹۵۵ء)

اسلام کا سیاسی و معاشی تصور

یہ بات بخوبی معلوم و مشہور ہے کہ اسلام محض کوئی مابعد الطبیعی عقیدہ نہیں۔ بلکہ وہ زندگی کا ایسا مکمل نظام اور جامع تصور ہے جو ایک منطقی ربط کا حامل ہے۔ ہم اس کے نظریات کا ایک مختصر خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ وہ ہر بڑے منصوبہ کے بعض اجزاء سے اتفاق کرتا ہے اور بعض دیگر حصوں کو رد کر دیتا ہے۔ ہر منصوبہ کا اس طرح مختصر بیان یہ ظاہر کر دے گا کہ کوئی ایسی اہم خرابی یا تواں کی بنیاد ہی میں موجود ہے، یا وہ عواقب جو ناگزیر طور پر اس سے رونما ہوتے ہیں اسے فاسد کر رہے ہیں۔

اصول عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ داروں نے مجرد حریت اور مساوات کی تبلیغ کی۔ مگر مملکت تنازع للبقا میں غیر جانبدار رہ کر اس کا تدارک نہ کر سکی کہ ظالمانہ عدم مساوات سر نہ اٹھانے پائے۔ معاشرہ کو جاگیر کی اور شخصی حکومتوں کی ظلم و زیادتی سے آزادی دلا کر اس نے ایک قسم کی زرخیز غلامی کی ترویج کی۔ آزادانہ معاہدہ اور آزاد رائے کا حق سب سے سو ثابت ہوا۔ سیاسی عمومیت معاشی غلامی کے ساتھ متحد ہو گئی۔ انگلستان اور امریکہ جیسے ممالک میں سرمایہ دارانہ جماعت نے ان خرابیوں کو رختہ رختہ دور کرنے کی ایسی کوششیں کیں جو بے قید سرمایہ داری سے صورت پذیر ہوتی ہیں۔ لیکن جو مشکلات اور دشواریاں اس نظام کے مزاج سے رونما ہوتی ہیں وہ معاشری انتشار و تشتت پیدا کرتی ہیں۔

اسلام حریت، اخوت اور مساوات پر مبنی ہے، اور اس کا فلسفیانہ نقطہ نگاہ خدا پرستانہ ہے۔ زندگی کے تمام فلسفے اور وجود سے متعلق اساسی انداز سے زبردست عملی نتائج رکھتے ہیں۔ راسخ الاعتقاد اشتمالیت کا فلسفہ مادہ پرستانہ اور ملحدانہ

ہے۔ اس کے برعکس اسلام یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ زندگی ایک روحانی مانعہ، ایک روحانی پس منظر، ایک روحانی سطح نظر اور مقصد رکھتی ہے۔ کائنات پر بے بصیرت مکیکانی قوتوں کی کارفرمائی نہیں ہے، اور نہ وہ محض مادہ پرستانہ جدلیات کی تاریخ ہے۔ زندگی ایک مادی اساس بھی رکھتی ہے، اور اس کی اس حیثیت کو اسلام نظر انداز نہیں کرتا۔ یہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ انسان کو روحانی طور پر آزاد رکھنے کی خاطر اسے مادی خوش حالی کا یقین دلایا جائے۔

ایک ہر بان، ہمہ دان، اور ہمہ توان، ہستی کی تخلیق کردہ کائنات اخلاق سے بے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ وہ قطعاً خیر و خوبی ہے۔ جس کے طریقہ کائے عمل چند دائمی اقدار کو وجود بخشتے ہیں۔

روح اور جسم کے درمیان، یا دنیا اور آخرت میں کوئی تناقض نہیں۔ چونکہ خدا ایک ہے اس لیے جملہ موجودات باہم مربوط ہیں۔ مسلمانوں کو دوسری دنیا کی خوش حالی سے قبل اس دنیا کی خوش حالی کے لیے دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اخلاقی علت و معلول یہاں اس دنیا میں جس طرح اپنے اثرات مترتب کرتے ہیں ایسے ہی وہ اپنے اس عمل کو آخرت میں جاری رکھیں گے۔ اشمالیہ تخلیق کے من جانب اللہ ہونے کی تردید کرتی ہے، اور اس کی تمام تاریخ انسانیت کی تشریح تمام مادی مظاہر کی طرح سر اسر مادہ پرستی پر مبنی ہے۔ صرف پیدائش دولت کے طریقے اخلاقی، مذہبی اور تمدنی اقدار پیدا کرتے ہیں۔ تاریخ کی قرآنی تشریح بالکل اس کے برعکس ہے۔ وہ دعویٰ کئے ساتھ کہتا ہے کہ قوموں کا عروج و زوال قوم کے اعتقادات اور سیرتوں میں تبدیلیوں کے سبب سے ہوتا ہے اور اسلام یہ یقین رکھتا ہے کہ بصیرت سے محرومی کے باعث قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ قرآن کی رو سے حقیقی انقلاب کسی قوم کی زندگی میں واقع نہیں ہوتا جب تک کہ اس کے اخلاقی اور مذہبی نقطہ نگاہ میں بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔

ان الله لا یغیر البقویر حتیٰ یغیروا خدا کسی قوم کی زندگی میں اس وقت تک

بافسحہ۔ تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک کہ ان کے

(انفال - ۵۳) نفوس کے انداز تبدیل نہیں جاتے۔

قرآن مادی طور پر خوش حالی قوموں کی مثالیں پیش کرتا ہے جو مادہ پرستانہ تنگ نظری کے سبب تباہ ہو گئیں۔ قانون اخلاق کے ابدی حقائق پر ایمان نہ لانے سے وہ خود غرض اور ظالم بن گئیں۔ انھیں اصلاح کے لیے بڑی بڑی مہلتیں دی گئیں لیکن جب انھوں نے خدا کی نشانیوں کی پرواہ نہ کی تو مسزاکا دن ان پر آ پہنچا اور وہ تباہ ہو گئیں۔ ”خدا نے خیر و شر کی میزان قائم کی ہے۔ یہ میزان ایسی حساس ہے کہ ہر ذرہ اس میں وزن کیا جاتا ہے۔ اور جس کا نتیجہ اپنے وقت پر ظاہر ہوتا ہے۔“ تاریخ کا اسلامی نظریہ اس کے خدا پرستانہ نقطہ نگاہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اور تاریخ کا اشتہالی نظریہ اس کی مادیت سے رونما ہوتا ہے۔ یہ دو نظریات کلی طور پر باہم ایسے متخالف ہیں کہ ایک خدا پرست مسلمان کے لیے مارکسی، اشتہالی بننا ناممکن ہو گیا ہے۔

فاشیستوں نے محض پیدائش دولت اور مساویانہ تقسیم کی پرستش کو مملکت کی پرستش سے تبدیل کر دیا۔ مملکت کی پرستش بجز بڑے پیمانہ پر قبائلیت کے، جو دور وحشت کی تہذیب کی یادگار ہے، اور کچھ نہیں۔ ”غلط یا صحیح جو کچھ بھی ہو میرا وطن ہے۔“ فاشیت ایک طاقتور مملکت کی تعمیر چاہتی ہے۔ اور بطور فوق الفرد مہستی کے مملکت کی پرستش کی تلقین کرتی ہے۔ اسلام بھی ایک طاقتور مملکت کی تعمیر کی ضرورت محسوس کرتا ہے جو قوم کے اساسی حقوق کا تحفظ کرے، باہر کے حملہ آوروں سے اپنا بچاؤ کرے۔ اور طاقت ور کی ظلم و زیادتی سے کمزور کی حفاظت کرے۔ اسلام ایک اجتماعی اور سیاسی مذہب ہے، اور اس کے تمام آئین و دستور کا تعلق معاشری عدل اور معاشری اتحاد سے ہے۔ تمام مملکت یا اس کے قائدین اور حکمرانوں کی غیر مشروط اطاعت واجب نہیں ہے۔ قانون اور نظم و ضبط کی خاطر بالادستوں کی اطاعت کی تعلیم دی گئی ہے۔

لیکن یہ اطاعت ہمیشہ احکام کے اخلاقی ہونے پر مشروط ہے :
 لا طاعة للمخلوق في معصية الخالق خالق کی نافرمانی کر کے مخلوق کی اطاعت نہ کی جائے۔
 اسلام کا اساسی اصول ہے۔ صدر حکومت تک کے اعمال و احکام پر ایک
 ادنیٰ ترین باشندہ ملک برسر عام نکتہ چینی کر سکتا ہے۔
 اسلام کے نزدیک قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ خود اُن حضرات نے
 لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اگر آپ نے نادانستہ کسی کو نقصان پہنچایا ہے تو وہ
 اپنے انتقام کا حق خود آپ کے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ فاروق اعظمؓ اور
 حضرت علیؓ بار بار بلا دور رعایت داد خواہی کے لیے عدالت میں بحیثیت مدعی
 اور مدعا علیہ کے حاضر ہو چکے ہیں۔

اسلام شوریٰ کے ذریعہ حکومت کی تعلیم دیتا ہے۔ آنحضرتؐ تقریباً ہر روز
 معاملات حکومت میں اپنے اصحاب سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ قرآن اوصافِ
 حسنہ ہی سے بطور خوبی کے اس وصف کا اظہار کرتا ہے کہ وہ مستبد اور آمر نہیں
 ہوتے بلکہ اجتماعی اہمیت کے تمام معاملات باہمی مشورہ سے طے کرتے ہیں۔
 قرآن میں مسلمانوں کو امت و سطی کا خطاب دیا گیا ہے۔ جو انتہاؤں میں
 ہمیشہ خیر الامور اور سطہا پر عمل کرتے ہیں۔ یہ یونانیوں کے نظریہ حیات کے
 مشابہ ہے۔ جن کا قول تھا کہ زیادتی میں کچھ بھی نہیں۔ خیر الامور اور سطہا کا اصول
 اور سطاطالیسی اخلاقیات میں محوری نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت
 اس کی تمام تعلیمات اور عمل میں جاری ہے۔ اسلام کی جملہ اخلاقیات عملی اخلاقیات
 ہے۔ جس نے ریتان کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ اسلام بنی نوع انسان کا مذہب ہے
 یہ فرشتوں کے لیے نہیں ہے۔ ہر حکم میں انسان کی اصلی فطرت کو مع اس کی
 تمام جبلتوں اور خواہشات کے ملحوظ رکھا گیا ہے۔ وجدانات اور جذبات
 زندگی کے لیے بطور آلات کے ہیں۔ یہ نظم و ضبط میں لانے کے لیے ہیں ،
 فنا کرنے کے لیے نہیں۔ آنحضرتؐ کے ایک صحابی نے اپنے رنج و افسوس کا

اظہار ان الفاظ میں کیا تھا: ”جب میں آپ کی صحبت میں رہتا ہوں تو میرا اخلاقی رنگ نہایت بلند و برتر رہتا ہے۔ بلند خیالات اور معیارِ راست میری شعوریت میں جاری و ساری رہتے ہیں۔ لیکن جب میں آپ سے دور رہتا ہوں تو میری اخلاقی سطح یکجا یک پست ہو جاتی ہے۔ میں اپنی حالت پر کس قدر افسوس کرتا ہوں۔“ اس کو سن کر آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا: ”تم کو مایوس اور پست ہمت نہ ہونا چاہیے۔ تم انسان ہو فرشتہ نہیں ہو۔ اگر خدا یہ چاہتا کہ دنیا کو ایسی ہستیوں سے آباد کرے جو اخلاقی کش مکش سے آزاد ہوں، تو وہ ٹانگہ کو پیاں بساتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں چاہا۔ تمہاری اخلاقی پشیمانی اور یہ بلندی اور پستی کا احساس ایمان کی علامت ہے۔“ یہ سن کر آپؐ کے صحابی کو اطمینان حاصل ہوا۔

انسانی اصلاح و ترقی کے بعض عظیم پروگراموں کا خاکہ مختلف اقوام کے حالیہ مفکرین، قائدین اور مصلحین نے کھینچا ہے۔ ان اصلاحی تجاویز میں سے ہر ایک میں چند ایسے اصول ہیں جو اسلامی غیبات کے اجزاء ہیں۔ لیکن ان سب میں جزوی صداقتوں پر دروغ بیانی کی حد تک مبالغہ آمیزی کی گئی ہے۔ دیگر اجزاء کے اخفا کے ساتھ چند اجزاء پر متشددانہ تاکید نے انھیں بحیثیت مجموعی زندگی کے ساتھ سلوک میں ناکام و خامر رکھا ہے۔ حریت پسند عمومیت میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو اسلام کی جزو لاینفک ہیں۔ ہر ایک کو مساوی مواقع ملنے، اور قانون کی نظر میں سب کے برابر ہونے کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ لیکن نسلی اور قومی تعصبات حریت پسند عمومیت کے عقائد و اعمال کو اب تک فاسد کر رہے ہیں۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے یہ کافی حریت پسندانہ نہیں ہے۔ نہ اسلام اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی تائید کر سکتا ہے، جس میں سود کو ایک مرکز حیثیت حاصل ہے۔ دنیا کے ہاشیہ خیال میں آنے سے قبل اسلام نے تمام علوم کی آزادی کے ساتھ آزادیِ تقریر اور آزادیِ ضمیر کی تعلیم دی تھی۔ دین میں کوئی جبر و اکراہ نہیں ہے۔ یہ قرآن کے اساسی اصولوں میں سے

ایک ہے۔ مغربی عموماً شہری حقوق میں باشندوں کی مساوات کے اسلامی حکم کو تسلیم کرتی ہے لیکن وہ باشندوں کی اکثریتوں اور اقلیتوں میں تقسیم کو ضروری اور مخالف جماعتوں کے وجود کو لازمی سمجھتی ہے جن کا مقصد حکومت کے معاملات میں تقریباً ہر چیز کی مخالفت کرنا ہوتا ہے۔ یہ مخالفت صرف مخالفت کی خاطر کی جاتی ہے جس کا مقصد بے اعتبار کرنا اور برسرِ اقتدار جماعت کو بالآخر بے دخل کرنا ہے۔ اشتہالیوں اور فاشسٹوں و دونوں نے انتخابی جماعتوں کی سرکھٹوں کو ترک کر دیا، اور صرف ایک کارفرما جماعت قائم کی جو افراد یا جماعتوں کی طرف سے کسی قسم کی مخالفت برداشت نہ کیا کرے۔ اسلام کا سارا جہان ان دونوں متبادل صورتوں کے خلاف ہے۔ ایک جماعت کی حکومت باشندوں کے آزادانہ احساسات کے اظہار کو سلب کر لیتی ہے۔ ایسی ایک جماعتی حکومتوں میں فرد کے لیے کوئی آزادی باقی نہیں رہ سکتی۔ اس کو یا تو جماعت کے احکام کی موافقت کرنی پڑتی ہے یا اپنے ضروری حقوق سے دست بردار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح حریت پسند عموماً جماعتوں کی جماعتی سیاسیات کے اقتدار کی جدوجہد میں صداقت اور عام خوش حالی برطرف ہو جاتی یا نہایت ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہر پارلیمان میں قوم کے باشندوں کی گروہ بندی ہوتی ہے۔ ایک آزاد انسان یا بند بن جاتا ہے اس طریقہ میں ایک آزاد خیال انسان اگر کبھی وہ منتخب بھی ہو جائے تو نکلا سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ کوئی جماعت اس پر اعتماد نہیں کر سکتی۔ سچی اسلامی مجلس شوریٰ میں جیسا کہ حضرت عمرؓ اکثر طلب فرمایا کرتے تھے، اصحابِ فہم و کردار بغیر کسی آمرانہ جماعت کو ترتیب دیئے یا اکثریت اور اقلیت میں منقسم ہوئے، باہم مجتمع ہوا کرتے تھے۔ اگر کوئی اسلامی مملکت مجالس یا مشاورتی جماعتوں کو مخصوص یا عام مسائل کے حل کرنے کے لیے طلب کرے تو ہر رکن ایک آزاد رکن ہونا چاہیے۔ جو خاص علاقوں یا خاص مفادات کی نمایندگی کرے، جو کسی پارٹی کے طریقہ پر منتخب نہ ہوا ہو۔ اس کا انتخاب صرف اس کے علم اور قابلیت کی بنا پر ہوا ہو۔

اسلامی مملکت، فاشستی مملکت کے پیش نامہ کے بعض اجزاء کی، اس کے
 جملہ تصورات کی تائید کیے بغیر تو شق کرتی ہے۔ فاشیت قوم کو ایک مصنوعی کل
 میں ڈھالنا چاہتی ہے۔ جس میں مفاد کی خاطر لڑائیوں کو اتنا کھل کھیلنے کا موقع
 نہ دیا جائے جس سے قومی یکانگت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ اس میں ذاتی
 ملکیت کے حق کو اسلام کی طرح تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن آجروا جبر کے تمام
 حقوق مملکت کی پوری نگرانی اور اختیار میں ہوتے ہیں۔ فاشستی پیش نامہ میں بہت
 کچھ ایسی چیزیں ہیں جو قابل تعریف ہیں۔ لیکن فاشستی مملکت کا اصلی محرک فاسد
 ہے۔ اس مملکت کا قیام نسلی یا قومی اساس پر ہوا ہے۔ مملکت ایک موضوع پرش
 بن گئی ہے جو خود اپنی ایک زندگی افراد کی زندگیوں کے علاوہ رکھتی ہے۔ یہ
 مابعد الطبعی اور فساد نوسی وجود کسی قسم کے اخلاقی مقاصد نہیں رکھتا۔ فساد کی
 اخلاقیات کا اس پر انطباق نہیں ہوتا۔ مملکت کا مقصد طاقت اور عظمت کو
 برقرار رکھنا اور باشندوں کو بے چون و چرا اور پراسرار اطاعت کی تعلیم دینا ہوتا
 ہے۔ بین الاقوامیت سے احتراز کیا جاتا ہے۔ عالم انسانیت ایک بے حقیقت
 چیز سمجھی جاتی ہے اور اس کے لیے کوششیں منافقت سے موسوم کی جاتی ہیں۔
 فاشیت کی رو سے قومی جماعتوں میں حیاتی تنازع للبقا ہوتی ہے جو برتر قوت
 کے ذریعہ بقا کے سوا اور کوئی قانون تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے لیے جنگ کے
 لیے تیار رہنا ہر مملکت کا اولین فرض ہے۔ اور امن پسندی ذلیل و خوار لوگوں
 کا مذہب و ایمان ہے۔ جبری ہم آہنگی کے طریقوں کو جاری کر کے قوم کے
 اندرونی تضادات کو رفع کرنے کے بعد یہ مختلف مملکتوں کے درمیان
 آویزشوں کی جو صدا افزائی کرتی ہے۔ جیسے یک جماعتی آمریت کی بنا قوت ہے
 ایسے ہی فاشستی مملکت کا اساسی تصور تصادم ہے۔ اسلام نسلی یا قومی
 حد بندیوں کو ہم اور قطعی تسلیم نہیں کرتا اور جملہ بین الاقوامی مساعی امن کی
 بہت افزائی کرتا ہے۔ ان تمام مبادیات و اصول کی اساس پر جو مختلف

مذاہب یا قوموں اور جماعتوں میں باہم مشترک ہیں، ان کے ذریعہ پُر امن تعاون عمل پر
 بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کو ان چیزوں کی طرف جو ان
 میں باہم مشترک ہیں، مسلمانوں کے ساتھ تعاونِ عمل کی دعوت دی گئی ہے۔
 فاشیت نے مجلسِ اقوام کی اساس کا مضحکہ اڑایا۔ مجلسِ اقوام اور اس کی
 جانشین اقوامِ متحدہ نے نہایت اعلیٰ نصب العین کا اعلان کیا۔ لیکن ان کو رو بہ عمل
 لانے میں بُری طرح ناکام رہیں۔ بجائے امن کے قوت ان کے قلوب پر حکمران
 تھی۔ اور اس ذہنی ساخت کے ساتھ بین الاقوامی انصاف کے دائرہ میں کوئی
 حقیقی کامیابی حاصل کرنے کی بہت کم امید ہو سکتی تھی۔ اولاً یہ کہ ان کے لیے
 انصاف کے ایک کھلے طریقے پر متفق ہونا ہی دشوار تھا۔ پھر اگر اتفاق سے
 وہ راضی بھی ہو جائیں، اور انھیں کوئی ایسا ردِ قربانی کرنی پڑے تو نہ وہ اس کا
 عزم رکھتی ہیں اور نہ ان کے پاس اپنے فیصلہ کو رو بہ عمل لانے کی کوئی قوت ہے۔
 مجلسِ اقوام پر فاشستی اعتراض اگرچہ اس کی عدم صلاحیت پر مبنی تھا لیکن اس میں
 سرے سے بین الاقوامی انصاف کے تصور ہی کو رو کر دیا گیا تھا۔ فاشستی
 تصور یہ ہے کہ طاقت ور کا یہ حق ہے کہ قبضہ کرے اور تصرف میں رکھے جہاں
 تک ممکن ہو سکے۔ اور یہ کمزور کی قسمت ہے کہ وہ مغلوب، محکوم، اور مطیع بنا
 رہے۔ اگرچہ اندرونِ مملکت آدیزشوں کو ختم کر دینے اور قومی یگانگت کو حاصل
 کرنے کے فاشستی طریقوں کی ستائش کی جا سکتی ہے۔ لیکن ایک حقیقی اسلامی
 مملکت کے لیے اس کا اتباع ایک زبردست اخلاقی زیاں ہے جس کا مقصد
 تمام نسلی اور قومی حد بندیوں سے ماوراء ہو کر عالمگیر امن و امان کا قیام ہے۔
 قرآن نے اپنی اس تعلیم سے ایک حقیقی اور موثر انجمنِ اقوام کی اساس کا
 اعلان کیا ہے کہ اگر دو جماعتیں اپنے کسی اہم حق کے لیے آپس میں لڑ پڑیں تو
 غیر جانب دار جماعتوں کی طرف سے منصفانہ طریقہ پر اس قضیہ کے تصفیہ کی
 کوشش کی جانی چاہیے۔ فیصلہ صادر ہونے پر متوافقہ جماعتوں پر اس کی پابندی

لازمی ہوگی۔ اگر کوئی جماعت سر تابی کرے، اور فیصلہ کے مطابق عمل کرنے سے انکار کرے تو تمام جماعتوں کو باہم مل کر قوت کے ذریعہ اس کو منوانا چاہیے۔ یہ ظاہر ہے کہ کوئی مجلس یا قوم کبھی با اثر نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اس قرآنی حکم پر عمل پیرا نہ ہو۔

مملکت فلاح و خیر

جدید مملکتوں نے تدریجاً ایک مملکت فلاح و خیر کا تصور پیدا کیا ہے۔ مگر ایک تاریخ دان کے لیے اس حقیقت سے انکار و شواہد ہو گئے کہ مملکت فلاح و خیر کو تشکیل دینے والے اور اس کو روبہ عمل لانے والے پہلے بدتر آنحضرت تھے۔ اس وقت بھی جب کہ انگلستان نے اپنے سیاسی اداوں کو ترقی دی تھی، اور پارلیمانی حکومت ایک قابل عمل اساس پر استوار کی تھی تو اس کا زیر دست فلسفی ہر برٹ اسپنسر اصول مردم داری کی حامی مملکت کے تصور کی تائید کر رہا تھا۔ جو محض ایک پولیس مین کی طرح کار گزار ہو۔ ایسی انتظامی مملکت اپنے باشندوں سے محصول جمع کرتی ہے تاکہ محصول ادا کنندوں کی طرف سے فوج اور پولیس کو رکھے اور حملہ آوروں اور قانون شکنوں کے خلاف باشندوں کی محافظت کرے۔ مملکت کو باشندوں کے قتل، ذاتی نقصان اور چوری و فریب دہی کا بھی السداد کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ مملکت زیادہ سے زیادہ تعلیم اور صحت عامہ پر خرچ کر سکتی ہے۔ قوم کی معاشی زندگی میں اسپنسر مملکت کی مداخلت کا خواہاں نہ تھا جو صرف آزادانہ معاہدہ پر مبنی ہونی چاہیے۔ قانون طلب و رسد بطور خود تواذن پیدا کرے گا۔ آدم اسٹون نے جو معاشیات میں اصول عدم مداخلت کا باوا آدم ہے حکومت کے اعمال کو صرف تین چیزوں پر محدود کیا ہے۔ اس کا قول ہے ”فطری آزادی کے اصول کے بموجب بادشاہ کو صرف تین فرانض انجام دینے پڑتے ہیں، اور یہ ہیں حقیقی اہمیت رکھنے والے تین فرانض جو فہم عامہ کے لیے سادہ اور آسان ہیں۔

اولاً، معاشرہ کو دیگر آزاد معاشروں کے تشدد اور حملہ سے محفوظ رکھنا۔
ثانیاً، سوسائٹی کے ہر رکن کی اس کے دیگر ارکان کے ظلم و زیادتی سے تاحید
ارکان حفاظت کرنا یعنی صحیح عدل و انصاف قائم کرنا۔ ثالثاً، چند تعمیرات
اور چند ادارہ بھارت قائم کرنا جن کا قیام و برقراری کسی فرد یا افراد کی قبیل اتحاد
کے مفاد کے لیے نہ ہو۔

ملکت کے یہ محدود فرائض آجروں اور سرمایہ داروں کو نفع اٹھانے کی بے روک
آزادی عطا کرتے ہیں، اور دولت کی غلط تقسیم معاشرہ کو دو مختار طبقوں
میں بانٹ دیتی ہے۔ ملکت کی طرف سے کوئی علاج تجویز ہونے سے قبل
مالداروں اور ناداروں کے درمیان خلیج وسیع ہو جاتی ہے۔ مزدوروں کی ہڑتال
کے خلاف حکومت پولیس کے فرائض انجام دیتی ہے۔ رفتہ رفتہ سیاست دان
اور انسائیت دوست مفکرین ملکت کے فرائض میں وسعت دینے کی تحریک
م شروع کرتے ہیں۔ پہلا علاج معاشری عدم مساوات کو جزوی طور پر ہموار کرنے
کے لیے محصول کا ایک اصلاح شدہ نظام تھا۔ سرمایہ دارانہ مملکتوں نے
اپنے دائرہ عمل کو وسیع کرنا شروع کیا۔ رہائش، بے روزگاری کا بیمہ، تندرستی
کا بیمہ، وظیفہ پیرانہ رسائی، اور دیگر متعدد سہولیات تدریجاً رفتہ رفتہ تجویز کی گئیں
اور بعض ممالک نے انھیں ایک حد تک اختیار بھی کیا۔ یہاں تک کہ ہم یورج
کے منصوبہ (Beveridge Scheme) پر پہنچتے ہیں جس نے
ایک مکمل لائحہ عمل، ایک ملکت خیر کے لیے ترتیب دیا ہے۔ یہ رجحانات
اس امر کا واضح ثبوت ہیں کہ دنیا کس طرح آزمائش و فرو گذاشت کے طولانی عمل
سے گذر کر درجہ بدرجہ آنحضرتؐ کے تصور ملکت کی محمولیت اور صداقت کو
دیکھنے کے لیے قریب آرہی ہے۔

سو کی بابت اسلام کا نقطہ نگاہ بہت واضح ہے۔ آنحضرتؐ اس پر مہر
تھے کہ تمام معاشی معاملات میں سود کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ اس وقت مغرب کے

تمام بڑے معاشین کسی قدر چھٹکتے ہوئے اسی نظریہ کے قریب آرہے ہیں کہ بینکاری کو قومی بنایا جائے اور سود پر قابو حاصل کیا جائے کیفینس نے مملکتوں کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اس خصوص میں اخلاقی اور مذہبی تحدیدات عاید کریں۔ لیکن اب بھی معاشین یہ خیال کرتے ہیں کہ سود کو مطلقاً موقوف کر دینا کوئی قابل عمل تجویز نہیں ہے۔ اس پر صرف قابو پانا اور پیدائش دولت کے لیے اس کو انتہائی ادنیٰ سطح پر سے آنا چاہیے۔ اسلام سرمایہ کے مالک کو پیداوار مزدور کے ساتھ حصہ دار بننے کی اجازت دیتا ہے تاکہ سرمایہ پیدائش دولت کے ساتھ ناقابل شکست طور پر مربوط رہے اور تجارت کے نشیب و فراز میں دونوں شریک رہیں۔ جب سود پیداواری سے محروم ہو جاتا ہے تو مدیون عام خطرات برداشت کرتا ہے۔ درالحالیکہ اس کو حکومت کی طرف سے یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ وہ قانوناً اپنی سودی رقم کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اسلامی نظام میں اس سرمایہ پر جو بے کار پڑا ہوا زکوٰۃ عاید کی گئی ہے۔ اسلام پیدائش دولت اور تجارت کو فروغ دینے کا خواہاں ہے اور یہ چیز اکتناز کے خلاف اس کے تمام سخت احکام کی تشریح کرتی ہے۔ اندوختہ دولت کا ایک حصہ حکومت لیتی ہے اور اسے اجتماعی فلاح و بہبود خاص کر غریب طبقوں کو مدد دینے میں خرچ کرتی ہے۔ مملکت خیر و فلاح کو انسانی محنت اور قدرتی ذرائع سے نفع اٹھا کر پیدائش دولت کی ہمت افزائی کرتی پڑتی ہے۔ لیکن اس کو اس سے بھی باخبر رہنا پڑتا ہے کہ دولت ساری ہیئت اجتماعیہ میں سرایت کیے ہوئے ہے اور کسی حصہ میں بے جا فراوانی اور کسی دوسرے حصہ میں بے انتہائی کا باعث نہیں رہی ہے۔ قرآن آگاہ کرتا ہے:

کیلا یكون دولة بین الاغنیاء هنکم خبردار دولت صرف مالداروں میں گردش کرتی نہ رہے۔ (بختر۔ ۷)

بے محنت کے کمائی ہوئی دولت زیادہ تر سود اور فاضلات کے اکتناز سے جمع ہوتی رہتی ہے۔ یہ وراثت کے غیر منصفانہ قوانین یا کسی ایک کو تمام جائداد

کی وصیت سے بھی جمع ہوتی ہے۔ حق ملکیت اور ذاتی جائیداد کے اصول کو پیش کر کے اسلام نے ایک طرف ناواجبی دولت کے اکتناز اور دوسری طرف افلاس کے خلاف ضروری تنظیمات کر دیے ہیں۔ تمام بڑے مذاہب نے ہمیشہ خیرات پر بہت زور دیا ہے۔ اور بخیل و بے حس بالداروں کو مطعون کیا ہے۔ لیکن یہ اسلام ہی تھا جس نے منصفانہ تقسیم دولت کے مسئلہ کو کامیابی کے ساتھ عملی طریقہ پر حل کرنے کی کوشش کی۔ انسانی فطرت کا اندازہ کر کے اس نے یہ دریافت کر لیا کہ محض اخلاقی بند و مواعظت سودمند نہ ہوگی، جب تک کہ قوم کا معاشی نظام ضروری قوانین کے ذریعہ از سر نو ترتیب نہ دیا جائے۔ مذہبی عقیدہ اور اس کا زبانی اقرار نا کافی ہے۔ قرآن میں نیک لوگوں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لاتے اور اچھے کام کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں خیرات پر بحیثیت اصل نیکی کے زور دیا گیا ہے۔ پھر خیرات کی ارادہ کی اور جبری خیرات میں تقسیم کی گئی ہے۔ اپنی خوشی سے خیرات کرنے کی بابت یہ کہا گیا ہے کہ نیکوکار اپنی ضرورت سے زائد کوئی چیز نہیں رکھتے۔ وہ اند وختہ نہیں کرتے بلکہ اپنی زائد دولت کو خرچ کرتے ہیں۔ زکوٰۃ جس کی وصولی کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے، ہر قسم کی مصیبتوں کے لیے ہے۔ اسلام کے اہم ارکان میں سے یہ ایک ہے جس کا بیان قرآن میں اکثر نماز کے ساتھ اس تشبیہ سے کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کی عبادتیں جو خیرات نہیں دیتے خدا کے پاس بے اثر اور ناقابل قبول ہیں۔ اپنے گرد و پیش کی معاشی زندگی پر نظر فرما کر آنحضرتؐ نے متعدد موقوفوں پر اس امر کی صراحت فرمائی کہ کسی مقدار سے اوپر فاضل دولت شمار کی جائے، اور کس حد تک اس پر محصول عائد کیا جائے۔ اگر معاشرہ کے معاشی نظام میں بنیادی تبدیلیاں واقع ہوں تو ہمیشہ منصوبہ کے اقتضا اور مقصد کو پیش نظر رکھ کر اس کی جزئیات میں حالات کی مناسبت سے مطابقت دی جاسکتی ہے۔ اسلام کی رو سے جمع شدہ فاضل دولت اخلاقی اور معاشی مصرت کا موجب ہوتی ہے، اور

غریب، مفلوک الحال بے بس لوگوں کے اخلاق بگاڑ دیتی ہے۔ جس سے پورا معاشرہ فاسد ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاکی اور نیز افزونی اور بخشش و رحمت کے ہیں۔ جو جماعت اس کی پابندی کرتی ہے وہ پاک ہوتی اور پھلتی پھولتی ہے۔ کیونکہ اصلی خوش حالی بجز اجتماعی صحت مندی کے اور کچھ نہیں۔ معاشی زندگی کی کارکردگی اور ترقی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ یہ مسلمانوں کے بیت المال کا محور ہے۔ آنحضرتؐ کو تمول اور افلاس دونوں سے اندیشہ تھا۔ آپؐ نے غربت و افلاس کے انسداد کو اسلام کے اہم مقاصد میں سے بیان فرمایا ہے۔ متعدد دیگر مذاہب نے افلاس کی مدح سرا کی اور روحانیت کی حد تک پہنچا دیا ہے۔ یہ انداز فکر افلاس اور سادہ زندگی میں خلط مبحث کا نتیجہ ہے۔ سادہ زندگی کی آنحضرتؐ نے توصیف فرمائی، اور اس پر عمل کر کے دکھلایا۔ لیکن افلاس کے متعلق آپؐ نے خدا سے دعا فرمائی کہ اسے انسانوں سے دور رکھے، جیسا کہ آپؐ کا ارشاد ہے:

الفقر سواد الوجه فی الدارین افلاس دونوں جہانوں میں موجب رو سیاہی ہے جس کے سبب بعض دفعہ ایمان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ آپؐ دولت کی افزونی سے ہر سال سنتے۔ یہ روایت کی گئی ہے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ”مسلمانو! مجھے تمہارے افلاس سے زیادہ تمہارے تمول سے اندیشہ ہے۔“ آپؐ کے بعد جب ایران فتح ہوا، اور بیش قیمت مالی غنیمت کے انبار حضرت عمرؓ کے سامنے لگائے گئے، تو آپؐ کی آنکھیں اشکیار ہو گئیں۔ کسی نے دریافت کیا ”اے امیر المومنین! یہ محل شادمانی اور مسرت کا ہے نہ کہ غم و اندوہ کا۔“ اس پر خلیفہؓ نے ارشاد فرمایا ”مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ اسلام کے لیے خطرہ نہ ثابت ہو۔“ یہ اظہار خیال اسلام کے ان مخالف اور جاہل نکتہ چینیوں کی آنکھیں کھول دے گا جو یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتے کہ مالی غنیمت کی محبت سلبتین اسلام کی جنگ آزمائش کا بھی اصل محرک بنی ہوئی تھی۔

زکوٰۃ کا آئین جو اسلامی مملکت خیر کا ایک محوری نقطہ ہے اس امر کا متقاضی ہے کہ ہم اس کی مزید وضاحت کریں۔ آنحضرتؐ کا ارشاد ہے ”صرف زکوٰۃ کی ادائیگی ہی میں تمہارے اسلام کو پناہ مل سکتی ہے۔ اپنے مال و دولت میں سے زکوٰۃ ادا کرو۔ یہ تمہیں پاک و صاف بنائے گی۔ اور تمہیں ان کا حق ادا کرنے کے قابل بنائے گی جو تمہارے رشتہ دار ہیں۔ سائل، ہمسایہ اور مسکین کے حقوق سے باخبر رہو، اور فضول خرچی میں مبتلا نہ ہو۔“ جو قوم زکوٰۃ کو موقوف کر دیتی ہے، وہ قحط و فلاکت سے ہم آغوش ہوتی ہے۔“ بغیر زکوٰۃ کے اللہ کے نزدیک نہ ایمان قابل قبول ہے نہ عبادت۔“

کوئی مملکت اسلامی مملکت کہلانے کی مستحق نہیں، اگر وہ زکوٰۃ کے احکام سے بے اعتنائی برتنی ہے۔ کیونکہ اسلام کی رو سے مملکت کا مقصد بجز اجتماعی فلاح و بہبود کے اور کچھ نہیں، اور اجتماعی فلاح بغیر زکوٰۃ کے ناممکن ہے۔ اگر انفرادی حق قانون سازی اور ذاتی ملکیت کو انفرادی آزادی میں بطور ایک ضروری عنصر کے شامل کیا جائے۔ لیکن یہ نظام بلا اصلاحی محاصل کے اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے، تو بعض لوگ یقیناً اپنی حاجت سے زیادہ اس کو حاصل اور جمع کر لیں گے، اور دوسرے بے لوائی اور افلاس میں چھوڑ دیے جائیں گے۔ اس لیے طریقہ تحصیل اور تقسیم دولت پر حکومت کا اختیار اور قابو ہونا چاہیے۔ اسلام کی سیاسی کامیابی کے بعد بعض عرب قبائل اسلامی مملکت کے حلقہ اثر میں بلا اسلام کی روح کو بھولی سمجھے اور اخذ کیے بسرعت داخل ہوئے شروع ہوئے۔ قرآن میں ایسے لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ جب وہ اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایمان لے آئے ہیں تو ان سے کہا جائے کہ انہوں نے صرف اسلام کی قوت کے آگے اپنا سر اطاعت جھکا دیا ہے اور ایمان تو ایک قلبی اثر پذیری کا معاملہ ہے۔ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد ایسے متعدد قبائل نے زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا اور عدم ادائیگی محصل کی مہم شروع کر دی۔ آنحضرتؐ کے جانشین متخیر تھے کہ ایسے لوگوں سے کیا معاملہ کیا جائے جو خود

کو مسلمان کہتے ہوں، خدا کی وحدانیت پر ایمان لاتے ہوں، اور نماز ادا کرتے ہوں، اور خلیفہ کس طرح اہل ایمان کے خلاف ہر سر جنگ ہو سکتا ہے؟ ابتداءً یہ خیال حضرت عمرؓ جیسے مضبوط ارادہ رکھنے والے لوگوں کا بھی تھا۔ لیکن اس خصوص میں آنحضرتؐ کے خلیفہ اولیٰ حضرت ابو بکرؓ اسلام پر ایک صاف اور واضح مدبرانہ نظر رکھتے تھے آپ کا خیال تھا کہ بغیر زکوٰۃ کے ایمان نامکمل رہتا ہے۔ نمازیں ادا کرنا لیکن یہود و عامہ میں حصہ نہ لینا اور اس کے لیے ایثار اور قربانی نہ کرنا فی الواقع ایمان کی نفی و انکار ہے۔ آپ نے فرمایا میں ان سے لڑوں گا جنہوں نے اس محصول کی ادائیگی سے انکار کیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بھی آپ کی اعلیٰ بصیرت اور اٹل فیصلہ کی داد دی اور واقعہ ایک سختی ریز جنگ اس مقصد کے تحت لڑی گئی۔ مقام اشوس ہے کہ مابعدہ مانوں میں یہ لازمی محصول جو فلاحی مملکت کا سرمایہ قوت تھا اور جس کی تحصیل و تقسیم مملکت کے ذریعہ ہونی چاہیے تھی، اختیار ہی بن کر رہ گیا اور اس کو ادا کرنے والے کے ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیا گیا۔ مغرب کی معاشیات عدم مداخلت نے معاشی توازن پیدا کرنے کے لیے افراد کی روشن خیالی خود مطلبی پر اعتماد کیا تھا، اور اب اس چیز کو دنیا جانتی ہے کہ ان وجدانات کے غلط مطالعہ نے کیا افرا تفری برپا کر رکھی ہے۔ خود مطلبی ایسی روشن خیالی ثابت نہیں ہو سکتی کہ افراد کی اجتماعی مفادات کسی من جانب اللہ انتظام سے ایک دوسرے کے موافق ہو جائیں۔ مسلمان مملکتوں نے جو زکوٰۃ کے معاملہ میں مسلمانوں کے ایمان پر اعتماد کیا تو وہ غلطی کی مرتکب ہوئیں۔ حکومت کے اختیار و قابو سے نکل کر زائد سرمایہ بیت المال میں جمع نہ ہو سکا، اور بہت سے فلاح و بہبود کے منصوبے بھی افراد کی ضمیر و ایمان پر چھوڑ دیے گئے۔ اسلام نے پیدائش و تقسیم دولت کے انتظام کی ذمہ داری حکومت پر عائد کی تھی۔ اسلامی حکومت کو ہمہ گیری عفریت بنے بغیر اس کام کے کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ قانون سازی کا اہم مسئلہ حکومت کی مداخلت اور فرد کی آزادی دونوں کے حدود کے تعین کے لیے ہے۔ اسلام نے اس مسئلہ کو ایک دل پذیر اور سہل العمل طریقہ پر حل کیا ہے۔ لیکن مسلمان مملکتوں نے خود اس تجویز کو غارت

کر دیا۔ زکوٰۃ ایک محصول ہے جو ہمسریہ پر عائد کیا جاتا ہے۔ یہ دولت کو ان حصوں میں گردش کرتا ہے جو اس کے زیادہ حاجت مند ہوتے ہیں۔ زکوٰۃ دولت کی ربط و ہی اجتماعی فلاح بہبود کے ساتھ کرتی ہے، اور یہ اہول عدم مداخلت کی نقیض ہے۔ مسلمان مفکرین اور مشہور عالمان دین، اخلاقی پاکیزگی اور عام خوش حالی کے لیے زکوٰۃ کی اہمیت کو تسلیم کر چکے ہیں۔ یہاں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی ایک عبارت پیش کی جاتی ہے جو اسلام کے ایک ولی صفت مفکر تھے۔ فرماتے ہیں: ”اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی سوء فہم نہ ہونا چاہیے کہ زکوٰۃ کا حکم دو مقصدوں کی تکمیل کے لیے دیا گیا ہے: ایک نادیدہ نفس، اور دوسرے بے لوائی کے خلاف فرائضی اسباب۔ مال و دولت، بخل، خود غرضی، باہمی عناد، نفرت اور اخلاقی تنزہل پیدا کرتی ہے۔ ان خرابیوں کا بہترین علاج مال و زر کی فیاضانہ بخشش و عطا ہے۔ اس سے بخل کا استیصال اور خود غرضی کا علاج ہوتا ہے۔ یہ معاشی رخنوں کو پُر کرتی اور اس کی جگہ جذبہ رفاقت پیدا کرتی ہے۔ یہ رفاقت اعلیٰ اخلاقی کردار کا سنگ بنیاد بن جاتی ہے۔ جب یہ نشوونما پاتی ہے، تو ایماندارانہ سلوک کے عادات کی پرورش کرتی ہے۔ رفتہ رفتہ لیکن یقین کے ساتھ یہ شریفانہ اوصاف انسان کو اخلاقی برتری کا نمونہ اخلاق بنا دیتے ہیں۔ اس کے معنی تمام نادیدہ نفس کے ذریعے اصلاح ذات کے ہیں۔“

زکوٰۃ قومی اور معاشرتی اخلاص کے خلاف ایک نہایت موثر تدبیر ہے۔ کیونکہ ایک شہری بنا اس وقت تک محکم نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ کسی درست معاشی اساس پر استوار نہ ہو۔ ایک سوسائٹی اپنے معاشی نظام ہی کے ذریعہ اپنے محتاج اراکین کی ضرورتوں اور حاجتوں کا ان کی حیثیت کے مطابق انتظام کر سکتی ہے۔ وہ گدا گردوں کو پھیلنے سے روکتی ہے۔ کیونکہ نادار، معذور، اچانچ، یتیموں اور ایسے ہی محتاجوں کے دیگر تمام قبیل کی مناسب طریقہ پر نگہداشت کی جاتی ہے، اور انھیں بھیک مانگنے کی ذلت اور بے عزتی سے بچایا جاتا ہے۔ یہ مملکت ہی کا کام ہے اور اس کو ان لوگوں کی پرورش و پرورشیت کا کفیل ہونا چاہیے۔ مگر یہ بوجھل و مہواری اسی وقت

قابلِ اطمینان طریقہ پر انجام دی جاسکتی ہے جب کہ حکومت کے معمولی ذرائع آمدنی کے ساتھ زکوٰۃ کی صورت میں ایک معتد بہ رقم دولت مندوں سے حاصل ہوتی رہے۔ قرآن نے چند ایسے طبقوں کے نام گنائے ہیں جو زکوٰۃ کی رقم سے امداد و اعانت کے مستحق ہیں۔

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا والمؤلفۃ
خیرات غریب و مساکین کے لیے ہے اور ان کے لیے جو
اس کام پر مامور ہوں، اور ان کے لیے جو جدید
الایمان ہیں، اور ان کے لیے جو غلامی اور قرض
میں ہیں، اور یہ راء حق میں خرچ کرنے اور مافرد
کے لیے ہے، یہ خدا کا حکم ہے اور خدا جانتے
والا اور حکمت والا ہے۔

غریب اور محتاج کے دو لفظ اس قدر جامع ہیں کہ ان تمام حالتوں کی فرست
بنانا ناممکن ہو جائے گا جن میں انسان ضروریات زندگی کے لیے اعانت کا خواستگار
ہوتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے محتاجوں کی قبیل میں نہ صرف ملازمت کے نا اہل لوگوں کو
بلکہ بے روزگاروں کو بھی شامل فرمایا ہے۔ یعنی ایسے لوگ جو کام کر سکتے ہیں۔
لیکن جنہیں کام نہیں ملتا۔ ان میں سے ایک قسم خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے۔ آنحضرتؐ
انسانیت کو زبردست آزادی دلانے والے اور اس کے سخت آرزو مند تھے کہ غلامی
کے رواج کو برخواست کر دیا جائے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ کسی غلام کو آزاد کرنا انتہا درجہ
قابلِ قدر عمل ہے۔ چونکہ قدیم تہذیبوں کا جملہ معاشی نظام غلامی کے رواج پر قائم تھا۔
اس لیے بیک جنبشِ قلم اس کو ختم کرنا ناممکن تھا۔ چند اعمال کے ارتکاب اور ترکِ فعل
کے کفارہ ہیں بطور تدبیر کے غلاموں کو آزاد کرنے کا حکم دیا گیا۔ غلاموں کے ساتھ
رفق و ملاحظت کا سلوک کرنے کے لیے آقاؤں سے پُر جوش اپیلیں کی گئیں۔ لیکن
اس اصول کی رو سے کہ حکومت تمام اہم معاملات کو افراد کے آزادانہ حق قانون سازی
کے ساتھ اپنے ہاتھ میں لے لے، حکومت پر یہ چیز بھی لازم کر دی کہ وہ اپنی آمدنی کا

ایک حصہ غلاموں کی آزادی پر صرف کرے۔ حکومت کو اس شخص کی بھی اعانت کرنی چاہیے جو قرض میں گھرا ہوا ہو اور بد قسمتی سے اس حالی زار میں مبتلا ہو گیا ہو۔ غیر مفید قرض داری سے روٹنی بخشنا بھی حکومت کا ایک فرض ہے۔ فی سبیل اللہ کی اصطلاح رفاہ عامہ کے تمام اعمال پر حاوی ہے۔

(ثقافت، جولائی ۱۹۵۶ء)

اسلام اور جمہوریت

اکثر مغربی ممالک میں اب نظامِ مملکت جمہوری ہے۔ لیکن جمہوریت ایک کلی تصور ہے جس کے کئی پہلو اور کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً سیاسی جمہوریت، معاشی جمہوریت، معاشرتی جمہوریت۔ ہو سکتا ہے کہ کسی قوم میں ان میں سے ایک کا وجود ہو اور دوسری اقسام مفقود ہوں۔ سیاسی جمہوریت وہاں پائی جاتی ہے جہاں دستور مملکت عوام کی مرضی سے بنایا گیا ہو اور آزادانہ طور پر عوام کے منتخب نمائندے ایک مجلس شوریٰ میں دستور وضع کر سکیں اور آئین و قوانین میں حسب ضرورت رد و بدل کر سکیں۔ معاشی جمہوریت وہاں پائی جاتی ہے جہاں دولت کی افزائش و آفرینش نے قوم کو مختلف طبقات میں تقسیم نہ کر رکھا ہو۔ جہاں جاگیر داری اور سرمایہ داری نے قوم کی دولت کو چند افراد کے ہاتھوں میں مرکوز نہ کر دیا ہو۔ معاشرتی جمہوریت وہاں ہو گی جہاں مذہب یا نسل یا رنگ یا زبان کے فرق و امتیاز نے برتری اور کمتری پیدا نہ کی ہو اور جہاں سوسائٹی میں تمام افراد کے میل جول میں تعصبات کی دیواریں حائل نہ ہوں۔ دراصل دین کا مل کی طرح جمہوریت بھی ایک نصب العین ہے اور کسی قوم کی زندگی بھی پوری طرح اس کے مطابق نہیں ملتی۔ انگریزوں کو دیکھیے کہ ان میں بادشاہی بھی ابھی تک موجود ہے، دارالامرا کا ادارہ ہے جس کے اراکین کو عوام منتخب نہیں کرتے اور اس کے ساتھ ساتھ دارالعوام بھی ہے۔ جاگیر داری اور سرمایہ داری پروٹال تاریخچہ ارتقاء نے کافی کاری ضربیں لگائی ہیں لیکن ابھی تک ان جلی ہوئی رسیوں کے بل باقی ہیں۔ مغرب میں لوختر کی اصلاح کلیسا سے لے کر آج تک کئی ہیجان خیز انقلاب ہوئے ہیں اور ہر انقلاب میں جمہوریت دو قدم آگے بڑھی

ہے لیکن منزل مقصود کو کوئی قوم نہیں پہنچی۔ آغاز اسلام کا انقلاب ایک ہمہ گیر
تغیر حیات کا متقاضی تھا اور ان تمام تحریکات کی رفتار کا رخ جمہوریت کی طرف تھا۔
لیکن بہت جلد قدیم روایات پھر ابھر آئیں۔ خلافت سلطنت میں تبدیل ہو گئی
سرہمایہ داری، زمینداری، جاگیر داری اور غلامی پھر عود کر آئی اور وہ انداز فکر و عمل
روز بروز جس نے بلال حبشی کو سردار ان قریش کا ہم رنگ بنا دیا تھا۔ فتوحات
کی بدولت وجود دولت کا تھ آئی وہ ایک محدود اور مخصوص طبقے میں سمٹتی گئی،
اسلامی تعلیم، قرآنی تلقین اور رسول کریم کا میدان طبع اور طرز عمل غلامی کا
بتدریج قلع قمع کر دیتے۔ لیکن فتوحات کے نشے میں مسلمان یہ سب کچھ بھول
گئے اور ہمارے بعض جدید علمائے کرام کی طرح یہ کہنے لگے کہ اسلام نے غلامی
کو منسوخ تو نہیں کیا فقط ان سے رحم کا برتاؤ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ ایک
حکیم مغربی نے سچ کہا ہے کہ دین سے قوت پیدا ہوتی ہے اور پھر قوت ہی
دین کو فنا کر دیتی ہے۔ رسول کریم اپنی نادار قوم کے لیے خدا سے زندگی کی
بنیاد ہی ضرورتوں اور آسائشوں کے لیے دعا فرمایا کرتے تھے مگر اس کے
ساتھ ہی ان کی خدا واد بصیرت اس خطرے سے بھی آگاہ تھی کہ دولت کی
غرائی مسلمان کے ایمان و اعمال کی تخریب کا باعث بن جائے گی۔ چنانچہ
حدیث نبوی سے یہ بھی ملتا ہے کہ مجھے مسلمانوں کے افلاس سے اس قدر ڈر نہیں
لگتا جس قدر کہ ان کی دولت مندی سے۔ اسلام کی قوت کی بدولت جس کا ظہور
میں آنا ناگزیر معلوم ہوتا تھا۔ یہی انداز نگاہ صحابہ کرام کا بھی تھا۔ چنانچہ کسریٰ
کا خزانہ اور قیمتی مال و اسباب، جو کسی عرب کے خواب میں نہ آیا تھا، جب فتح
ایران کے بعد مدینے کے بازار میں لاکر ڈھیر کر دیا گیا تو حضرت عمر فاروق کی
آنکھوں میں سے آنسو ٹپکتے دکھائی دیے۔ یہ آنسو اشک مسرت نہ تھے بلکہ
اپنی متابع عزیز یعنی اسلام کی تخریب کے خطرے سے آنکھیں نمناک ہو گئی تھیں
کسی نے پوچھا کہ یہ تو مقام مسرت ہے آپ ابیدہ کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ

نے فرمایا مجھے ڈر ہے کہ یہ دولت اسلام اور مسلمان کو اس کے مقصود حقیقی سے ہٹا دے گی۔ اس خطرے کو حضرت ابو ذرؓ نے نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ مگر ارباب اقتدار نے ان کو خطلی سمجھا۔ جن کے گھروں میں زر و جواہر کے خزانے جمع ہو رہے تھے، انھوں نے کہا کہ اڑھائی فی صد زکوٰۃ کے بعد باقی لا محدود دولت اندوز کی حلال ہے۔ یہ کیفیت خلافت راشدہ کے زمانے ہی میں پیدا ہو گئی تھی۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے دو ارادہ سالہ عہدِ زریں میں تو حسب مال و جواہر کو ابھرنے کا موقع نہ ملا لیکن حضرت عثمان غنیؓ کے عہد میں معیشت اور معاشرت کا رخ پلٹنے لگا۔ امیر معاویہ نے تمام بیت المال کو اپنی جیب میں ڈال لیا تھا اور محمولات کو اپنی سیاسی قوت کے استحکام کے لیے صرف کرتے تھے چنانچہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ مدینے کا ایک شہری ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی پریشانیوں کا ذکر کر کے ان سے کچھ مال طلب کیا تو امیر معاویہ نے خزانچی سے کہا کہ اس کو ایک لاکھ درہم دے دو۔ اس گدا سے بہرم کو اتنی رقم کے حصول کے بعد بھی تکرار میں کچھ شرم نہ آئی۔ اس نے کہا کہ جناب اتنی رقم سے کیا ہوتا ہے۔ اس پر حکم ہوا کہ اسے ایک لاکھ درہم اور دے دیئے جائیں۔ جب وہ رقم لے کر چل دیا تو خزانچی نے ادب اور استعجاب سے عرض کیا کہ ایک معمولی شخص کے ساتھ آپ نے ایسی غیر معمولی فیاضی کیوں برتی۔ امیر معاویہ نے فرمایا کہ تم سیاست کو نہیں سمجھتے۔ میں نے یہ رقم اس ایک فرد واحد کو نہیں دی بلکہ مدینے کی کثیر آبادی کو دی ہے۔ یہ رقم آخر مدینے ہی میں خرچ ہو گی۔ گھر گھر ہماری فیاضی اور سخاوت کا چرچا ہو گا، اور لوگوں کی طبیعتیں ہماری طرف مائل ہوں گی۔

مطلق العنان حکومت ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور اخلاقی تخریب کا سرچشمہ اور تمام اقتدار سیاسیات کی تباہی کا باعث ہوتی ہے۔ ملت اسلامیہ میں اس وقت سے آج تک جو بے عنان سلطانی اور شہنشاہی کا دور چلا اس کو تھامنا ایسا ہی محال ہو گیا جیسے کوئی شخص سیلاب کو ٹانھوں سے روکنے کی کوشش کرے مسلمان

تیرہ صدیوں میں بھی غلامی کو منسوخ نہ کر سکے۔ نظام سلطانی کے خلاف کبھی کوئی تحریک
 پیدا نہ ہوئی۔ منقوشہ ممالک میں بڑی بڑی جاگیرداریاں پیدا ہو گئیں۔ علما کی زیادہ تعداد
 ظاہری عبادات میں یا معاملات کے بارے میں فقہی اختلافات میں اٹھی رہی اور
 ان علما کا کام جو سلطنت سے وابستہ تھے، یہی رہ گیا کہ سلاطین کے ہر فعل و قول کے
 جواز کے لیے صحت تلاش کریں اور فتوے دیں۔ دوسرے سلطنت میں نہ عوام کا دخل
 رہا اور نہ علمائے دین کو اصلاح معیشت و سیاست سے کوئی تعلق۔ اسلامی کھلاسنے
 والی سلطنتوں کے فقط یہی معنی رہ گئے کہ داناں حکمران اور امراء و وزراء اسلام کے
 نام لیوا ہیں۔ اسلام نام کے لیے رہ گیا، کام کے لیے نہ رہا۔ اجتماعی زندگی کو
 سنوارنے اور عادلانہ نظام قائم کرنے کی طرف کسی کو توجہ نہ رہی۔ اسلامی تاریخ زیادہ
 فاتحین کی اکھاڑ پکھاڑ رہ گئی۔ ہر کہ شمشیر زندہ بنا کر شواہد۔ جو شخص ظالم ہو یا
 فاسق و فاجر، تخت نشین ہو گیا اس کی قصیدہ خوانی شروع ہو گئی۔ اس قصیدہ خوانی
 نے صرف شاعری ہی کو جھوٹ اور مبالغے کا طیارہ نہیں بنایا بلکہ تمام قوم کو ریاکاری اور
 وروغ بافی کی تعلیم دی۔ مسلمان اپنے بادشاہوں کی شان و شوکت پر فخر کرنے لگے۔ اس
 انداز نگاہ کا اثر ایسا ہمہ گیر ہے کہ زمانہ حال میں بھی علامہ اقبال جیسا بھی المذت شاعر
 مفکر بھی دکن کے قطب شاہی سلاطین کے گورستان پر ایک موثر نظم لکھتا ہے اور
 کہتا ہے کہ اپنے شاہوں کو یہ اُمت بھوسلنے والی نہیں۔ اور حقیقتاً حالندہ صریح تاریخ
 اسلام کو منظوم کرنے میں چھٹتا ہے تو اس کا نام شاہنامہ اسلام رکھتا ہے۔ فردوسی کے
 داناں تو شاہنامے کا عنوان ضروری اور درست تھا لیکن اسلام کو شاہی سے کیا تعلق؟
 شاہی سے زیادہ کوئی چیز اسلام کی منافی نہیں ہو سکتی۔ حسن اتفاق سے ایک فی صد کبھی
 کوئی بادشاہ بھی مرد مومن اور سلطان عادل نظر آتا ہے لیکن یہ انسٹی ٹیوشن سراسر غیر اسلامی
 ہے۔ رسول کریم کو کسی نے ملک کہہ کر مخاطب کیا تو انھوں نے فرمایا کہ میں ملک یا سلطان
 نہیں ہوں اور ایک حدیث شریفہ میں ہے کہ شاہنامہ کا لقب خدا کے نزدیک کسی
 انسان کے لیے حدر و جہ مکرورہ لقب ہے۔

تاریخی لحاظ سے یہ امر ناقابل تردید ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد بہت جلد اسلامی انقلاب کے خلاف ایک ردِ عمل ہوا جس کی وجہ سے اسلام کے اصلی مشن کی تکمیل دشوار ہو گئی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ تاریخی حیثیت سے اسلام بالکل ناکام رہا۔ تاریخ اس کی توثیق ہے کہ مسلمان پانچ سات صدیوں تک تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں دیگر اقوام کے مقابلے میں پیش پیش اور ارتقاء کو شہرہ رہے۔ اس کی وجہ محض ملکی فتوحات نہیں ہو سکتیں۔ ملکی فتوحات تو علوم و تہذیب سے معرار ہونے والی اقوام نے بھی کیں۔ اس ترقی کا اصلی محرک اسلام کے زاویہ نگاہ کا وہ حصہ تھا جو ردِ عمل کے بعد بھی کار فرما رہا۔ مسلمانوں نے غلامی منسوخ نہ کی لیکن غلاموں کے ساتھ وحشیانہ اور انسانییت سوز سلوک کا خاتمہ کر دیا۔ یہاں تک کہ غلام آقاؤں کے معلم، وزراء، بکرہ سلاطین بن گئے۔ غیر مسلموں کے ساتھ مذہبی رواداری اسلامی ملت کا شعار بن گئی۔ منظرِ فطرت پر غور و غوض کو قرآن کریم نے عبادت میں داخل کر دیا تھا۔ رسول کریم نے عالم کو عابد پر ترجیح دی تھی اور عالم کی دوات کی روشنائی کو خونِ شہید سے افضل قرار دیا تھا۔ تحصیلِ علوم میں گہوارے سے لے کر قیر تک مسلسل کوشش کو دین کا جزو بنا دیا تھا اور یہ تاکید کی تھی کہ علم کی تلاش میں چین تک بھی سفر کرنا پڑے تو اس میں کوتاہی نہ کرو۔ پڑھنے لکھنے والے جنگی قیدیوں کے لیے مسلمان بچوں کو نوشت و خواند سکھانا قید سے رہائی کا فدیہ بنا دیا تھا۔ زندگی کی زینتوں کو انسانوں کے لیے حرام نہیں کیا تھا۔ بشرطیکہ وہ ظلم سے پیدا نہ ہوں۔ سینٹ پال کا ادیب و مورخ ڈین ایچ اپنے مجموعہ مضامین آؤٹ اسپوکن ایسیر میں دینی حکومتوں اور ملتوں کے نظریاتِ حیات کا ذکر کرتے ہوئے اس کا اقرار کرتا ہے کہ مسلمانوں میں اپنے دینی جذبے کے باوجود علوم کی جو شدید پیاس پیدا ہو گئی تھی وہ دینی ملتوں میں ایک مستثنیٰ چیز ہے۔

مسلمانوں میں سیاسی جمہوریت بہت جلد ناپید ہو گئی اور معاشی جمہوریت کی طرف انھوں نے خاص توجہ نہ کی لیکن اسلام کی تعلیم کے باقیاتِ صالحات میں سے ایک چیز مسلمانوں میں دیگر ملتوں کے مقابلے میں ہمیشہ نمایاں رہی۔ یہ جمہوریت کا وہ پہلو

ہے جسے سوشل ڈیموکریسی یا جمہوریت کہتے ہیں۔ مسلمانوں نے نسل کے امتیاز کو اگرچہ پوری طرح مٹایا نہیں تو اس کو اس قدر کمزور اور مدھم کر دیا کہ مختلف نسلوں کے مسلمان گورے، کاسے، زرو، سانے سب میں یک رنگی اور یک آہنگی کا شعور یا تحت الشعور کا جذبہ ہر حالت میں کم و بیش قائم رہا۔ ہمارے نزدیک اسلام نے نوع انسان پر جو احسانات کیے ہیں ان میں سے یہ احسان، احسانِ عظیم ہے۔ دنیا میں اشاعتِ اسلام کی حیرت انگیز سرعت کے اسباب مغرب کے غیر مسلم مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آتے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تعصب نے ان کی تاریخی بصیرت میں خلل ڈال دیا ہے۔ اکثر ایک ہی جھوٹ کو الاپتے رہتے ہیں کہ اسلام دنیا میں بزورِ شمشیر پھیلا۔ تاریخ کا بے لاگ مطالعہ اس بتان کو رفع کر دیتا ہے۔ دنیا میں ایسے خطے موجود ہیں جہاں مسلمانوں کی سیاسی قوت کم و بیش ہزار سال تک بے مزاحمت باقی رہی لیکن وہاں مسلمانوں کی آبادی کی کثرت نہیں ہے۔ یورپ کے مشرق اور مغرب میں مسلمانوں نے سینکڑوں برس بڑے جمالی و جلال کے ساتھ حکومت کی لیکن وہاں مسلمان اقلیت میں ہی رہے۔ کیونکہ دین کے بارے میں جبر کو قرآن نے ناجائز قرار دیا تھا۔ اس کے مقابلے میں ایسے خطے موجود ہیں جہاں مسلمانوں کی قومی ملکیت قائم نہیں ہوئی لیکن وہاں کی کثیر آبادی مسلمان ہے۔ دوسروں کا مذہب یا سیاست کے جبر سے بدل سکتے ہیں اور یا مسلسل اور منظم تبلیغ سے۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ مسلمان مسلمانوں نے جبر کیا ہو یا سلطنت کے ذرائع کو تبلیغ میں استعمال کیا ہو۔ مسلمانوں میں نہ کوئی منظم کلیسا تھا اور نہ مشنریوں کے گروہ جن کو حکومتوں سے یا سربراہی داروں سے مدد ملتی ہو۔ ایسی کوششوں کے فقدان کے باوجود اسلام انڈونیشیا جیسے وسیع خطے میں پھیلا تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ اس کے وہی وجوہ ہو سکتے ہیں، ایک اسلام کی رساوہ صد اقلیتیں اور دوسرے بے امتیاز نسل و رنگ برادری اور برابری کا احساس۔ عرصہ ہوا ایک مرتبہ راقم الحروف کو کلکتہ میں بڑکال کے مشہور کپیڈان سائنٹسٹ سر پی۔ سی۔ رائے سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ ایک

وسیع المشرب اور بے تعصب انسان تھے اور غائباً برہم سماج کے پیرو تھے۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ جو کوئی پرکھتا ہے کہ اسلام بذور شمشیر پھیلا وہ نہایت مکروہ جھوٹ بولتا ہے۔ فرماتے تھے کہ بنگالی ہی کو دیکھ لو کہ میرے ایام شباب میں یعنی کوئی نصف صدی پیشتر مسلمانوں کی سیاسی قوت بنگال میں صفر ہو گئی تھی۔ ان کے پاس معیاشی قوت بھی نہ رہی تھی اور مسلمان اس خاندان قوت کے دور میں بنگالی میں اکثریت نہ تھے بلکہ اقلیت تھے لیکن اس نصف صدی میں میرے دیکھتے دیکھتے ان کی تعداد چند دہائیوں سے بڑھ گئی ہے۔ یہاں کس نے تلوار باری ہے۔ فرماتے تھے اس کا واحد سبب اسلامی اخوت، برابری اور برادری کا احساس ہے۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے جن کو اچھوت سمجھ کر جانوروں سے بدتر سلوک کیا وہ انسانی سلوک کے لیے اسلامی برادری میں داخل ہوتے گئے۔

آج کل جمہوریت محض ایک نظام حکومت کا نام نہیں رہا۔ بلکہ مذہب کی طرح ایک ہمہ گیر تصور بن گیا ہے اور جس طرح مذہب کا تصور مبہم اور غیر معین ہو گیا ہے وہی حال جمہوریت کا ہے۔ کمیونزم یا اشتراکیت اور سوشلزم دونوں کا دعوائے ہے کہ جمہوریت کی صحیح شکل یہی ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ میں اکثر لوگ نہ صرف کمیونزم کے خلاف ہیں بلکہ سوشلزم کو بھی اپنی جمہوریت کے بنیادی سمجھتے ہیں۔ انگلستان میں جب اٹلی کی وزارت میں محنت کشوں کو اکثریت کی بنا پر حکومت کو سنبھالنے اور ڈھکالنے کا موقع ملا تو انھوں نے حکم کھلا سوشلزم کو اپنا مقصود قرار دیا۔ انگلستان اور روس کے سیاسی اور معیاشی نظامات ہیں بعد المشرقین ہے لیکن دونوں سوشلزم کے مدعی ہیں اگرچہ روسی اپنا انتہائی نصب العین کمیونزم بیان کرتے ہیں اور سوشلزم کو ایک منتر کی سرِ راہ قرار دیتے ہیں۔

مسلمان بھی اس کے مدعی ہیں کہ اسلام ایک صحیح اور خالص قسم کی سوشلزم ہے۔ لیکن ان کے ہاں یہ لفظ مشرکہ معنی نہیں ہوتا۔ ہر شخص جو دینی یا سیاسی رہبری کا آئندہ مذہب ہے وہ غوام کو ہم خیال بنانے اور ان کے جذبات کو اپنے اغراض کے لیے

اجبار نے کے لیے یہی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ بعض اسلامی سوشلزم کی مرکب اصطلاح استعمال نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک فقط اسلام ایک جامع مفہوم ہے اور سوشلزم اس کے اندر مضمر ہے۔ اگرچہ بعض دین و سیاست کو مخلوط کر کے رہنمائی کے مدعی ایسے بھی ہیں جنہیں سوشلزم سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ لامحدود زمینداری اور لامحدود سرمایہ داری کو بھی اسلام کے منافی نہیں سمجھتے۔ بشرطیکہ جن لوگوں نے ناجائز طور پر عساکشی یا حکومتوں کی خوشامد یا غدار کی سے وسیع خطہ ہائے زمین پر قبضہ جمار کھا ہے، وہ زکوٰۃ ادا کر دیا کریں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ قرآن کریم کی اس ہدایت کو بھی دہرائیں کہ معاشی نظام ایسا ہونا چاہیے جس میں دولت ایک اقلیت کے ہاتھوں میں مرکوز نہ ہو جائے۔ اگر کوئی ان سے کہے کہ تم سوشلزم کے خلاف ہو تو وہ کبھی علانیہ اس مخالفت کا اقرار نہ کریں گے اس لیے کہ سوشلزم کا جمہوری تصور عوام کے ولی نشین ہو چکا ہے اور اس کی کھلم کھلا تردید کر کے عوام سے ووٹ حاصل کرنا دشوار ہو جائے گا۔ اگر وسیع اور لامحدود زمینداری اور سرمایہ داری کی حمایت نہ کریں تو دولت مندوں سے چندے کی بڑی رقمیں نہ مل سکیں گی، اور نہ وہ ووٹ حاصل ہو سکیں گے جو دولت مند زمیندار اور سرمایہ دار اپنے اقتدار یا باؤ سے عوام سے حاصل کرتے ہیں اور جن کے نمائندہ بن کر وہ مجلس آئین ساز میں حکمرانی میں شریک ہو جاتے ہیں۔ ایران، اور مصر اور پاکستان اور انڈونیشیا میں بعض مذہبی جماعتیں اسلام کے نام پر ہنگامہ آرا ہیں۔ لیکن اگر ان کے تصورات، عقائد، اور اعمال کا جائزہ لیا جائے تو سوشلزم دور کا دور معمولی جمہوریت بھی قائم نہیں ہو سکتی۔ کچھ ایسے ہیں جو الارض للہ کا من مانا مفہوم لے کر اپنی سوشلزم کی تمام عمارت اس پر کھڑی کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں بعض کی سوشلزم ہمہ گیریت ڈیٹیلیٹین ازم کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ان کے خیال میں اگر اشتراکیت کے ساتھ تو حید اور رسالت کے اس تصور کو جوڑ دیا جائے جو ان کے نزدیک صحیح ہے تو ایک نصیبی نظام قائم ہو سکتا ہے۔ خالی اشتراکیت کو تو مذہبی لوگ بھڑکتے ہیں لیکن اگر اسے دہلوییت عامہ

کہہ دو تو رب العالمین سے اس کا رشتہ قائم ہو کر وہ عین اسلام بن جاتی ہے۔
اسلام اور جمہوریت یا مخصوص طور پر جمہوریت کی وہ شکل، جسے سوشلزم کہتے ہیں
اس کے متعلق دو سوالات نہایت اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اسلام اس کا قائل ہے یا نہیں اور
اگر ہے تو کس انداز اور کس رنگ میں۔ دوسرے یہ سوال کہ یہ انداز سیاست و معیشت
کبھی تاریخی حیثیت میں معرض شہود میں آیا بھی ہے یا نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس ضمنی
سوال کو بھی جوڑ سکتے ہیں کہ اس وقت تمام دنیا میں پھیلے ہوئے اسلامی ممالک میں کہیں
جمہوریت یا سوشلزم ہے جی یا نہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی، جتھوں نے جذبہ انقلاب ہی میں زندگی گزاری، کچھ عرصہ
تک روک میں بھی رہے۔ چونکہ وہ مسلمانوں میں ایک انقلابی عالم شمار ہوتے تھے اس
لیے اسٹالین نے بھی ان کو ملاقات کا موقع دیا۔ مولانا نے اس کے سامنے اسلام کے
نظریات معیشت و سیاست پیش کیے جن کا انقلابی پہلو اسٹالین کے لیے بھی خوش آئند
ہو سکتا تھا۔ سب کچھ سن کر اس پختہ کار ماہر سیاست نے مولانا سے پوچھا کہ کونسی قوم یا
کونسا ملک اس نظریہ حیات پر زندگی کو ڈھال رہا ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اس وقت تو
کوئی مسلمان قوم اس پر کاربند نہیں۔ اسٹالین نے کہا کہ جب کوئی قوم اس پر عمل کرے
اپنا تجربہ دنیا کے سامنے پیش کرے گی تو اس وقت ہم اس کے قابل عمل یا قابل قبول
ہونے کی نسبت کچھ رائے قائم کر سکیں گے۔ مسلمان اس وقت اسلام، جمہوریت اور
سوشلزم کے متعلق ژولیدگی فکر اور غلط بحث میں لکھے ہوئے ہیں۔ ایسے حالات میں
ابنہ فریبی یا خود فریبی تو ممکن ہے لیکن حقیقت رکھی نہیں ہو سکتی

(ثقافت، فروری ۱۹۵۶ء)

انسانِ کامل

اس اہم اور مقدس مضمون پر اظہارِ خیال کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اذرہ تمہید انسان اور کمال کے تصورات کی نسبت مختصراً کچھ عرض کیا جائے۔ اس کائنات میں مخلوقات کے جو لامتناہی اقسام ہیں ان میں سب سے زیادہ عمیر الفہم ہستی انسان ہے۔ انسان نے خاک و باد و آب و آتش اور مظاہرِ فطرت کی نسبت بہت کچھ یقینی علم حاصل کر لیا ہے اور اس یقینی علم کی بدولت انسان خارجی فطرت کا مسخر بننا چلا جاتا ہے۔ لیکن خود اپنی نسبت اس کا علم ابھی ابجد سے آگے نہیں بڑھا۔ اپنی نسبت اس کا علم ابھی تک سطحی ہے۔ مگر جنوں کی طرح ظنون کے بھی بے شمار اقسام ہیں۔ انسان نے اپنی نسبت متضاد تصورات قائم کر رکھے ہیں اور اس تضاد کو رفع کرنا مقصود عقل و حکمت اور غایت اخلاق و ایمان ہے۔ مگر یہ کام نہایت درجہ دشوار اور محال معلوم ہوتا ہے۔ طبیعی حکماء نے ماورین نے انسان کو لا محدود مادی کائنات کا ایک اتفاقی منظر اور آبی جانی کیفیت قرار دیا۔ ہستی بے مقصود کے بجز منطاطم میں چند لمحوں کے لیے ابھرنے اور جلد بے پروا موجوں سے دوبارہ ہم کنار ہوتے والا حسابِ ناپائدار۔ زمان و مکان کی آخریت کا ایک تغیر پذیر اور بے ثبات شائبہ دوسری طرف آئیڈیالسٹوں نے اس کو مصدر و محورِ ہستی بنا دیا۔ بقول عارفِ رومی:

قالب از ماست شد نے ما از و

باوہ از ماست شد نے ما از و

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ یہ جہان بے پایاں بظاہر پریم ایام میں غرق معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ زمان و مکان لا محدود سب کا سب اس ایک جام میں غرق ہے جو انسان کا نفس یا دل ہے۔ مذہبِ حکما ہوں یا ادیانِ عالیہ سب

کے سب انسان کی منتضا و فطرت کو علی الاعلان پیش کرتے ہیں۔ انسان ایک طرف
موجود ملائک ہے تو دوسری طرف مردود و خلائق۔ یہ احسن تقویم والی مخلوق کرتی ہے تو
اسفل السافلین کی تاریک گراہیوں میں پہنچ جاتی ہے، اور اوپر اٹھتی ہے تو اس کے
ڈانڈے الوہیت سے جاملتے ہیں اور تخلقوا باخلاق اللہ کا کھٹن راستہ سلے
کر سنے کے بعد مجاہدہ اور معرفت اس کو حقیقت ازلی کا اس درجہ ہم صفت بنادیتے
ہیں کہ آگ میں پڑے ہوئے لوہے کی طرح بشریت اور الوہیت کا امتیاز و شوار ہو جاتا
ہے۔ ایک طرف وہ اس امانت کا امین ہے جس کو قبول کرنے میں ارض و سماں زکے
لیکن یہ اہم امانت قبول کرنے والا غلوم کا جھولا دیوانہ بھی ہے۔
بقول غالب:

بروہ آرم از امانت ہر چہ گردوں برنشاط
ریخت مے بر خاک چوں در جام گنجین نہ داشت
یا بقول حافظ:

آسمان بار امانت نہ توانست کشید
قرعہ غالی بنام من دیوانہ زوند
کسی نے اس کو مجبور شخص قرار دیا اور کسی نے اس کو اپنی تقدیر کا معمار تصور کیا۔
میر تقی کہتا ہے:

ناستی ہم مجبوروں پر یہ تمت ہے مختاری کی
جو چاہیں سو آپ کرے میں، ہم کو عبث بدنام کیا
آزاد کا یہ فتویٰ ہے:

ہزار عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں بے اختیار بیٹھے ہیں

اس جبر کے مقابلے میں علامہ اقبال کی تلقین خودی ہے:

خود کی کو کر بند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بند سے خود بویچھے بتائیری رضا کیا

منطق خواہ کچھ ہی کہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ اختیار کے پتھر چارہ اور نہ صبر کے گریز۔ انسان کی نسبت جتنی باہم متضاد باتیں کی گئی ہیں ان سب میں ہر ایک جزئی صداقت کی حامل ہے۔ انسان عقل کے جوہر سے مشرب ہے لیکن اس عقل کو عنان کیونچہ جذبات کا غلام بھی انسان ہی بناتا ہے۔ انسان فطرت کا عظیم الشان شاہکار بھی ہے اور فطرت کی سب سے بڑی لغزش بھی۔ قرآن کریم کو اس نظر سے پڑھیے تو اس مخلوق کا عجیب نقشہ نظر آتا ہے۔ از روئے قرآن یہ بھی درست ہے کہ انسان کو خدا نے اپنی فطرت کے مطابق بنایا۔ فطرۃ اللہ الی فطرۃ الناس علیہا لیکن یہ انسان ناشکر اللہ لکنود بھی ہے۔ خلق من عجلی جلد باز بھی ہے۔ کبدیادرد و کرب بھی اس کی فطرت کا لازمی جزو ہے۔ انسان کی زندگی کا سودا زیا وہ تر گھاسے ہی کا سودا ہے۔ ان الا انسان لفی خس۔ انسان آزادی کا خواہاں ہے اور دین بھی حریت کی طرف اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ لیکن وہ خود اپنے آپ کو توہمات اور حرص و ہوس کی زنجیروں میں جکڑتا چلتا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسان عقل و ایمان اور جذبات شہوان کی مخالف لہروں میں پڑتا ہوا ایک بھنور رہ جاتا ہے۔

اسلام اور اس کی کتاب حکیم نے انسان کی یہ تمام کیفیتیں بیان کی ہیں لیکن ساتھ ہی یہ تلقین کی ہے کہ انسان کا وظیفہ زندگی اور مقصود حیات یہی ہے کہ وہ زندگی کے تضاد کو رفع کرتا ہوا مسلسل اس وحدت کی طرف قدم بڑھائے جو مقصد حیات و کائنات ہے۔ اس لحاظ سے دین اور حکمت عقلی میں کوئی تضاد نہیں۔ دین کی تعلیم بھی یہی ہے کہ تمام ہستی اپنی کثرت و تنوع کے باوجود ایک وحدت سے سرزد ہوئی ہے جو کثرت موجودات اور ظاہری تنوع کی شیرانہ بند ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون کا یہی گہرا مفہوم ہے کہ ہمارا ماخذ ایک وحدت خلاق ہے اور مقصود حیات پھر اسی کی طرف عود کرنا ہے۔ کئی شیعہ پر جمع انی اصلہ

ہر کسے کو در ماند از اصل خویش باز جوید روزگار و صلی خویش
عقل و حکمت کا بھی یہی وظیفہ ہے کہ مظاہر فطرت خارجی ہوں یا مظاہر نفس انسانی

غرضیکہ ہر جگہ انفس و آفاق میں ان قوانین کی جستجو کرے جن کی نسبت قرآن حکیم نے لائبل پیل لخلق اللہ کہا اور اسی کو دین قیم قرار دے کہ دین اور حکمت کو ہم آغوش کر دیا ہے۔ دین ہد یا علم یا اخلاق سب رفیع اخلاص اور کی مختلف کوششیں ہیں۔

آئیے اس لحاظ سے اسلام اور اس کے پیش کرنے والے رحیم و حکیم نبی کی تعلیم اور زندگی پر ایک طائرانہ نظر دوڑائیں۔

بہت سے فلسفے اور کئی ادیان زندگی کے ظاہری اور باطنی اہند او سے گھبرا گئے۔ کسی نے کہا کہ یہ متغیر عالم غیر حقیقی اور فریب اور اک یا مایا ہے اور گیان کے ذریعے سے اس فریب سے نجات حاصل کرنا زندگی کی غایت ہونی چاہیے کسی نے آرزوؤں کی اطمینان نا پذیر کشاکش سے بیزار ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ یہ درد سر ایسا ہے کہ سر جاتے تو جاتے۔ اس لیے اچھی اور بری تمام آرزوؤں کی تسخیر کنی ہی سے نردان حاصل ہو سکتا ہے۔ یونانیوں نے کہا کہ عالم حقیقی اعیان ثابتہ کا عالم عقلی ہے اور متغیر مظاہر کا عالم ہے حقیقت اور یہ ثابت ہونے کی وجہ سے قابل اعتنا نہیں۔ کسی نے ایک عالم کی بجائے خیر و شر کے آفریدہ دو عالم بتا دیے۔ ان میں سے ایک آفریدہ یزدان اور دوسرا آفریدہ اہرمن۔ اسلام نے سورہ فاتحہ کی پہلی ہی سطر میں ان تمام باطل نظریات کی تسخیر کر دی خالق کا نام کو رب یا پروردگار قرار دیتے ہوئے یہ بتا دیا کہ یہ رب کسی ایک عالم کا رب نہیں بلکہ رب العالمین ہے۔ تمام عوالم ایک ہی خالق کے آفریدہ اور ایک ہی پروردگار کے پروردہ ہیں۔ عالم جماد، عالم نبات، عالم حیواں، عالم انساں، عالم افلاک، عالم ملائکہ ایک ہی ہستی کے آفریدہ ہیں جو رحمان و رحیم ہے۔ رحمانیت میں رحمت کا جو منظر ہے اس کا تعلق آفرینش سے ہے جس کی نعمتیں اور برکتیں مخلوقات کے اعمال حسنہ کا اجر نہیں بلکہ رحمت خلاقی کا نتیجہ ہیں۔ اس کے بعد شان رحیمی ہے جس کا ظہور انسانوں کی غلط روی کے بعد ہوتا ہے۔ اگر انسانوں کی ہر لغزش پر گرفت

اور عذاب ہوتا تو زندگی محالی ہو جاتی۔ خدا کے ہاں عدل بھی ہے لیکن اس کی رحمت اس کے عدل کو بھی محیط ہے اسی لیے رب العالمین کو رحمن و رحیم کہنے کے بعد مالک یوم الدین کہا گیا ہے تاکہ رحمت کی سبقت انسان پر واضح ہو جائے۔ جس طرح اسلام کا پیش کردہ عذاب العالمین ہے اسی طرح اس کا نبی کامل بھی رحمت کلی کا مظہر ہے۔ کئی مذاہب و ادیان نے اس کائنات ہی کو ملعون قرار دیا تھا۔ نبی حکیمؐ نے کہا کہ یہ کائنات نہ غیر اصلی ہے اور نہ باطل و مردود۔ رہنا ماخلقت هذا باطلاً۔ خدا کی رحمت کلی کائنات میں جاری و ساری ہے وہ کسی ایک عالم تک محدود نہیں۔ حقیقی معرفت کا تقاضا یہ ہے کہ ہر عالم کو خدا کا ایک مظہر سمجھا جائے اور ہر مظہر میں خدا کی حکمتیں اور نعمتیں تلاش کی جائیں۔ رہبانیت کے مذاہب عالم مادی و جسمانی کو ملعون سمجھ کر فکر و عمل میں اس سے نجات حاصل کرنے میں کوشاں تھے اور روحانیت کی تکمیل کے لیے دنیا سے روگردانی اور بدن آزاری کو لازم گردانتے تھے۔ نبی حکیم و رحیمؐ نے یہ اعلان کر دیا کہ لا دھبانیۃ فی الاسلام۔ کوئی انسان دنیا کو رو کر کے نہ روحانیت میں ترقی کر سکتا ہے اور نہ خدا تک اس کی رسائی ہو سکتی ہے۔ انسان کے مقاصد اور جذبات میں بے شبہ تضاد پیدا ہوتا ہے لیکن اس کا علاج جذبات کشی سے نہیں بلکہ حدود و عمل سے ان میں توازن پیدا کرنا ہے تاکہ جذبات کی قوتیں نہ باہم برسر کار ہوں اور نہ عقل و ایمان سے دست و گریباں ہوں۔ قرآن و حدیث میں کئی جگہ نفیس اشارے اور جذبات کشی کے لیے شیطان کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ہر شخص کے ساتھ اس کا ایک شیطان لگا ہوا ہے۔ سننے والے صحابی نے پوچھا کہ کیا حضورؐ کے ساتھ بھی ہے۔ اس کا جواب بصیرت افروز جواب دیا گیا اسلام کی تمام امتیازی شان اس کے اندر موجود ہے۔ فرمایا کہ ہاں میرے ساتھ بھی ہے لیکن میں نے اس کو مسلمان بنا کر اس کو اپنے ساتھ رکھا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ از روئے اسلام دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جسے شہر مطلق کہہ سکیں۔ زندگی کی اکثر قوتیں خواہ وہ مادی و طبعی

ہوں یا نفسی، بجلی کی طرح بے طرف قوتیں ہیں۔ خیر و شر کا مدار ان کے صحیح یا غلط استعمال پر ہے۔ دیکھیے رسول کریم کی رحمت کلی کی تعلیم جس میں جذبات و شہوات کی شیطنت بھی زاویہ فکر و عمل کی تبدیلی سے معاون حیات اور ذریعہ ارتقاء بن سکتی ہے کمال صفات کا تصور خدا کی ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ خدا کی ذات کا طے کا فہم انسان کے لیے ممکن نہیں۔ خدا عظیم ہے لیکن اس کا علم انسانی قسم کا علم نہیں ہو سکتا ہو مشاہدہ اور استقرار و استخراج اور علت و معلول کے روابط سے آشنا ہونے کا نام ہے۔ وہ سمیع ہے لیکن اس کا سنتا اس قسم کی شنوائی نہیں ہو سکتا جو ہمارے آلہ سماعت کی پیداوار ہے۔ وہ بصیر ہے لیکن اس کی بصارت ہماری آنکھوں کی بصارت کے انداز کی نہیں ہو سکتی۔ وہ رحیم ہے لیکن اس کے رحم میں وہ انفعالی کیفیت نہیں ہو سکتی جو انسان کے جذبہ رحم میں پائی جاتی ہے۔

پیچ ماہیات اور صاف کمال کس نہ اند جز با شمار و مثال

ان صفات کا کمال صرف خدا ہی میں ہو سکتا ہے۔ بہت سے ادیان اس غلطی میں مبتلا ہو گئے کہ پیشوایان دین کو کامل ثابت کرنے کے لیے ان کو خدا کے صفات کا ملہ سے متصف کر دیا اور ان کو خدا کا اوتار بنا دیا۔ اس غلط انگاری سے نبوت الہیہیت بن گئی۔ ان مذاہب نے یہ نہ سوچا کہ جب خود خدا ہی انسان کا روپ اختیار کر سکے دنیا کی ہدایت کے لیے نازل ہو گیا تو انسانوں کے لیے وہ کس طرح نمونہ اور اسوۂ حسنہ بن سکتا ہے۔ انسان کی رہنمائی کے لیے تو انسان ہی کی اعلیٰ مثال کام آسکتی ہے۔ ان ادیان کے مقابلے میں محمد رسول اللہ کا کمال انسانیہیت کا کمال ہے۔ یہ ایسے انسان کا کمال ہے جو انسانوں کے سامنے اپنے آپ کو بندہ خدا کے طور پر پیش کرتا ہے اور خود معبود بننے کا خیال باطل اس کے واہمہ میں بھی نہیں گذر سکتا۔ وہ لوگوں سے کہتا ہے کہ میں عرضہ و راز تک طالب حق اور سوچتے والا انسان تھا اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ وہ ہدایت یافتہ ہونے کے بعد آپ کو خدا کا پیغام رساں کہتا ہے۔ وہ عالم الغیب ہونے کا مدعی نہیں۔ وہ

راست بازی سے کہتا ہے کہ مجھے غیب کا بس اتنا ہی علم ہے جتنا کہ خدا مجھے بخش دے
وہ خدا کی معرفت کلی کا دعویٰ نہیں کرتا۔ باقی انسانوں کے مقابلے میں بے حد حصول
یصیرت و معرفت کے بعد بھی معارفِ حق معرفتِ کمال پکارتا ہے۔ اسے خدا
تیری ذاتِ مطلقہ کو کما حقہ جانتے کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ وہ اپنے پیروؤں سے
کہتا ہے کہ امورِ دنیا کا علم تم کو مجھ سے زیادہ ہو سکتا ہے۔ بشریت کے تقاضے
سے مجھ سے بھی غلطی ہو سکتی ہے۔ ان اعتراضات سے کسی مخلص اور راست باز
انسان کے کمال میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا۔ و حقیقت کسی انسان کے لیے
دعوائے کمال خود نقص کی علامت ہے۔ رسولِ کریم کا کمال بشریت اور عبودیت
کا کمال ہے۔ رسولِ کریم خدا کے کامل نہیں بلکہ انسانِ کامل ہیں۔ اس برگزیدہ ہستی
کا کمال صفات کی ہمہ گیری اور عمل کی جامعیت ہے۔ جو خدا ان کو تمام عالم کے
لیے ہمیشہ کے لیے اسوۂ حسنہ بنانا چاہتا تھا، اس کی مشیت نے ان کو زندگی کے
تمام مراحل میں سے گزارا، اور ہر شعبہ حیات اور ہر مرحلے میں ان کے فکر و عمل کا
انداز اس شعبے میں انسانوں کے لیے شمع ہدایت بن گیا۔ بے کسی اور قیمتی سے بڑے
سرطانی تک انسانِ زندگی کے تمام مراحل طے کر ڈالے۔ وہ ایک مزدور کی
زندگی بھی بسر کر چکے تھے اس لیے مزدور کے حقوق و فرائض سے بخوبی آگاہ تھے۔
مزدوروں کو دنیا حقیر سمجھتی تھی لیکن سب سے پہلے اس نبی نے اعلان کیا کہ الکا سب
حبیب، اللہ جائز پیشہ اور مزدوری سے روزی پیدا کرنے والا خدا کا حبیب ہے۔
خدا کا حبیب ہونے سے اونچا درجہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ ہر قسم کے مصائب اور
مخالفت کے مقابلے میں اٹل صبر و استقلال، ناکامیوں میں کبھی مایوس نہ ہونا اور
کامیابی میں نخوت و غرور کو نفس کے قریب بٹھانے نہ دینا۔ دیانت داری اور
حکمتِ عملی سے ایک کامیاب تاجر کے لیے مثال بننا۔ ایک معمر بیوہ سے شادی
کر کے آخر دم تک محبت و وفا کی مثال پیش کرنا۔ کامیاب فاتح بن کر اذیت کیش
سنگ دل مجرموں کو لا تشریب علیکم الیوم کہہ کر معاف کر دینا۔ صلح و امن کو اپنی

مساعی کی غایت بتاتے ہوئے اگر جنگ کی ضرورت پیش آجائے تو شجاعت کی داد دیتے ہوئے بھی انسانیت کے اقدار کو نظر انداز نہ کرنا۔

باد و مثال ظریف باد و مثال مدارا

ایک مثنوی کی حیثیت سے ایسے عادلانہ قوانین پیش کرنا جن کی مثال اس سے قبل موجود نہ تھی۔ زندگی کا کوئی شعبہ ہے جس کی نسبت بنیادی ہدایت اس اسوۂ حسنہ میں نہ مل سکے۔ یار و اختیار کے ساتھ خوبی کا برتاؤ۔ اختلاف مسلک کے باوجود دوسری ملتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید۔ تمام افراد و اقوام کے لیے مذہب و تعمیر کی آزادی۔ لا الہ الا اللہ فی الدین کا اعلان عام۔ سوا ان امور کے جن میں خود فطرت نے تفاوت پیدا کر دیا ہے مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض میں عام مساوات۔ حصول علم کی فضیلت اور اس کی ترغیب افراد کی تعلیم کی مسلسل کوشش اور دعا۔ ارتقاءئے حیات کا یہ تصور کہ جس شخص کے دو دن ایک جیسے رہے اور اس نے کسی اچھے پہلو میں ترقی نہیں کی تو وہ گھاسٹے میں رہا۔ من استوا یوماہ فھو مغبون۔ روحانیت، حکمت اور اخلاق کی ابھی باتیں ان سے پہلے بھی انبیاء و اولیاء و صلحاء حکما کہتے چلے آئے تھے لیکن ایمان و حکمت عمل کی یہ جامعیت انہیں نہیں ملتی۔

حسن یوسف دم عیسیٰ پد بیضا داری

آنچہ خواہاں ہمہ وارند تو تنہا داری

نبوت ایسے ہی شخص پر ختم ہو سکتی تھی جس کی زندگی کسی پہلو میں تشنہ نظر نہ آئے۔ جو مزدور و کسان کے لیے بھی نمونہ ہو اور حاکم و حکیم کے لیے بھی۔ جو پیکار حیات اور اعتداد و افکار و جذبات میں صلح بخونی اور وحدت آفرینی کے ڈھب صرف نظری طور پر نہ بتائے بلکہ نصیب العین کو عملی جامہ پہنا کر افراد و اقوام کے لیے بلند ترین نمونہ پیش کرے۔ اس جامعیت کا انسان نہ تاریخ عالم نے بعثت محمدی سے پہلے پیش کیا اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے۔ محض

افکارِ عالیہ کے مقابلے میں زندہ عملی مثال کہیں زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ انسانوں کے اخلاقی اچھے نمونوں سے متاثر ہو کر عمدہ ساچھوں میں ڈھلتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تعداد میں اچھے نمونے محمد رسول اللہ ہی کی زندگی میں مل سکتے ہیں۔ ایسے ہی انسان کو انسانِ کامل کہہ سکتے ہیں جس کا کمال ہر شعبہ زندگی میں نظر افروز اور بہت افراہوا اور جس کی جامعیت سے انسانیت کا کوئی شعبہ خارج نہ ہو۔

(ثقیف، اکتوبر ۱۹۵۸ء)

اسلامی تہذیب کا تصور

اسلامی تہذیب کا کوئی تصور پیش کرنے سے پہلے، اسلام اور تہذیب ان ہر دو تصورات کو متعین کرنا لازمی معلوم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ مناسب ہو گا کہ اسلام کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پہلے یہ دیکھا جائے کہ تہذیب کا کیا مفہوم ہے اور شروع ہی میں اس ابہام کو رفع کرنا بھی ناگزیر ہے کہ تہذیب کو بعض اوقات تمدن کا مرادف خیال کیا جاتا ہے لیکن فکر میں وضاحت پیدا کرنے والوں نے ان دو تصورات کو خلط ملط نہیں کیا اگرچہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا بھی آسان کام نہیں اس لیے کہ کوئی تہذیب ایک خاص درجہ تمدن کے بغیر ممکن نہیں اور کوئی تمدن تہذیب سے بے تعلق نہیں ہو سکتا۔ انگریزی زبان میں سویلیزیشن اور کلچر کی اصطلاحوں میں بھی یہی ابہام ہے۔ اکثر مصنفوں نے ان کو ہم معنی سمجھ کر اپنی مرضی کے مطابق کبھی یہ لفظ استعمال کر دیا اور کبھی وہ۔ ہمارے زبان میں تمدن سویلیزیشن کا قریب تر ترجمہ ہے اور کلچر کا مفہوم تہذیب کا لفظ بہتر ادا کرتا ہے۔ اسلامی تہذیب کے تصور میں ہمیں تہذیب اور تمدن دونوں کے عناصر کو شریک کرنا ہو گا، اور یہ بھی غور کرنا ہو گا کہ ایک کا دوسرے پر عمل اور رد عمل کس انداز کا ہوتا ہے۔

سویلیزیشن اور کلچر کے متعلق ہم جب مغرب کے اہل فکر کے افکار کا جائزہ لیتے ہیں تو ان میں ایسی گونا گونی نظر آتی ہے جو لطف آفریں اور فکر انگیز تو ہوتی ہے لیکن تعریف و تحدید و تعین میں کوئی وضاحت پیدا نہیں کرتی۔

مغربیوں کے افکار کے کچھ نمونے آپ کے سامنے بغرض تفکر پیش کرتا ہوں۔ میتھو آرنلڈ کہتا ہے کہ کلچر کی مثال ایسی ہے جیسے شہد کی مکھیوں کا چھتہ ہو۔ اس

میں شہد بھی ہوتا ہے اور موم بھی۔ شہد میں شیرینی بھی ہے اور غذا، دوا اور شفا بھی۔
 قرآن کریم بھی اس کے متعلق کہتا ہے فیہ شفاء للناس۔ چھتے میں جو موم ہوتی ہے
 اس سے منیر و مستنیر شمع بنتی ہے۔ انسان کو نورِ علم اور شیرینی کھوار دونوں کی
 ضرورت ہے اور کلچر کا لب لباب یہی دو عناصر ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ تہذیب
 تربیت یافتہ فطرت کا نام ہے، اور بہترین تہذیب تمدن وہ ہے جس کے
 اندر ہر فرد کو اپنی فطرت کے ممکنات کو معرضِ شہود میں لانے کے لیے زیادہ
 سے زیادہ مواقع میسر ہوں۔ ایک حکیم کہتا ہے کہ اصل تہذیب یہ ہے کہ انسان
 ملنوں اور جماعتوں کے تعصبات سے بلند تر ہو جائے۔ یہ وہی خیال ہے جس کو
 غالب نے اسی شعر میں ادا کیا ہے:

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے اہاں ہو گئیں

کوئی کہتا ہے کہ تہذیب اخلاق احساس کا نام ہے۔ مذہبی شخص کہتا ہے کہ تہذیب
 زندگی وہ ہے جو خدا کی مرضی کے مطابق بسر کی جائے۔ کسی نے اس خیال کا اظہار
 کیا ہے کہ انسان کی زندگی اس کو مسلسل کثافت اور جمود کی طرف بھیختی رہتی ہے
 اس سے بچنے کے لیے لطیف جذبات، لطیف تاثرات اور لطیف اذکار میں
 زندگی بسر کرنا، تہذیب ہے۔ ایک تصور یہ ہے کہ خارجی فطرت اور باطنی فطرت
 انفس و آفاق ایک جنسِ خام ہے اس کے اندر نظم و آئین کی تلاش اور آفرینش
 اور حسن و جمال اور توازن پیدا کرنا تہذیب ہے کسی نے کہا ہے کہ تہذیب
 اچھی عورتوں کے اثر سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ایک دوسرے مفکر نے اس پر یہ
 اضافہ کیا ہے کہ کسی تہذیب کو جانچنے کا بہترین معیار یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس
 میں عورتوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا ہے۔ بعض مفکرین سنہ تہذیب و تمدن کے
 مخرب ہیلوؤں کی طرف توجہ دلاتی ہے۔ فرانسیسی حکما میں روسوان کا امام شمار
 ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کو فطرت نے آزاد پیدا کیا تھا لیکن تہذیب و

تمدن نے اس کو ہتھکڑیاں اور پٹریاں پہنا دی ہیں۔ ایڈورڈ کارپنٹر کی ایک مشہور کتاب، ہمارے طالب علمی کے زمانے میں بہت پڑھی جاتی تھی (Civization and Civilization) اس کا معنی ہے جو نوع انسان کو لاحق ہو گیا ہے، اب شدید ضرورت ہے کہ اس کی تشخیص کی جائے اور کوئی علاج تجویز کیا جائے۔

کسی کی تہذیب و تمدن پر کڑی تنقید ہے کہ اس کی ترقی میں جمہور کو ذلیل کر کے خواص کو ابھارا جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جہاں ذاتی ملکیت اور خود غرضی نے آہستی و بواریں پکڑ لی ہیں اس معاشرے کو مہذب نہیں کہہ سکتے۔ انسان کی ایک تعریف یہ ہے کہ وہ آلات استعمال کر کے نسل و الایموان ہے۔ لیکن آلات کی ترقی سے اعضا شکم ہوتے جاتے ہیں۔ موٹر نشینوں کی ٹانگیں نیم جہاں ہو جاتی ہیں۔ ایک مصلح مزاج مصنف لکھتا ہے کہ کوئی معاشرہ مہذب نہیں ہو سکتا جس میں قید خانے اور پائل خانے موجود ہوں۔ کسی نے کہا ہے کہ ہماری تہذیب اور تمدن کو بخور و دھواں تو انسان اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ہماری زمین عالم ارواح کا دارالجمہور ہے۔ ایک خیال یہ ہے کہ کسی تہذیب کو کامل نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہر تہذیب میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تخریب کے عوامل بھی پیدا ہوتے ہیں اگرچہ وہ عرصہ دراز تک آنکھوں سے اوجھل رہیں۔

اس کے متعلق بھی غالب کا یہ حکیمانہ شعر ہے :

میری تعمیر میں مضمحل ہے اک صورت خوابی کی

بیوی برف خرمین کا ہے خون گرم دھماں کا

اس افکار بیانی سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ تہذیب و تمدن کا مفہوم کس قدر

مہم ہے اور سب سے کار لائل اپنے دور کی مغربی تہذیب کا جائزہ لیتے ہوئے کہتا ہے

کہ یہ تہذیب تین عناصر پر مشتمل ہے بازو، پچھا پہ خانہ اور برائٹنٹ مذہب۔ تہذیب

تمدن کے متعلق اس کے درجے کے مفکرین جن کی عقلیت اور روحانیت عام طور پر

لطیف اور دور رس تھی ایسی بھٹکی ہوئی باتیں بھی کہہ گئے ہیں جیسا ایمر سن کا یہ فتویٰ کہ اعلیٰ تہذیب گرم ملکوں میں پیدا ہوتی نہیں ہو سکتی۔ سیاست، معیشت اور معاشرت میں آزادی وہیں پہنچتی ہے جہاں برف باری ہوتی ہو۔ جس گرم آب و ہوا میں کیسے اگتے ہوں وہاں انسان ہوس پرست اور ظالم ہوتے ہیں۔ ایمر سن جیسا بالغ الفطر ادیب اس سے زیادہ اور کہیں نہیں بھٹکا۔ لطیفہ یہ ہے کہ مسلمان مصنفین ابن خلدون کے زمانے میں نہایت سنجیدگی سے اس پر بحث کیا کرتے تھے کہ یورپ والے اس قدر غبی کیوں ہوتے ہیں اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ان کی سرد آب و ہوا اور برف باری ان کے افکار کو سمجھ کر کے عقلی نشوونما کا موقع نہیں دیتی۔

ان افکار اور لطائف سے گزر کر ہم اب اسلامی تہذیب کے تصور کو متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام کا ماخذ قرآن اور اس برگزیدہ مہدی کا کردار ہے جس نے اپنے قول و فعل سے تہذیب کا ایک خاکہ اور نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہاں ہر تہذیب اور تمدن میں امتیاز کرنا پڑے گا۔ اسلام نے پہلے اس قوم کی ہیرت کو ڈھالنے کی کوشش کی جس کا تمدن زیادہ تر قبائلی تمدن تھا۔ عرب کے گرد اگر دایسی قومیں تھیں جو ہزار ہا سال سے تہذیب و تمدن کی کمی منر لیں طے کر چکی تھیں مگر عربوں کے پاس نہ کوئی علوم تھے اور نہ کوئی فنون۔ فنون لطیفہ میں سے فن شعر کے سوا ان کے پاس کچھ نہ تھا۔ قرآن سے پہلے عرب میں کوئی کتاب نہ تھی جسے کسی مصنف نے تصنیف کیا ہو۔

ہندوستان، بابل، مصر، یونان، چین اپنے اپنے دور میں علوم و فنون اور اسباب تمدن میں ہیرت انگیز ترقی کے نمونے چشم روزگار کو دکھائیے تھے۔ اسلام کے پاس کوئی علوم نہ تھے جنہیں تہذیب قوموں کے سامنے بطور مثالی پیش کر سکتے تھے۔ اہل ایران، اہل روم اور اہل مصر تمدن کے لحاظ سے عربوں کے مقابلے میں ہزار ہا فرسنگ آگے تھے۔ اسلام کو پیش کرنے والا انقلابی نبی ان تمدنوں کے اکثر پہلوؤں سے آشنا تھا۔ وہ گرد و پیش کے مذاہب کا بھی

جانتے چکا تھا۔ وہ قدیم تمدنوں کی داستانیں بھی سن چکا تھا، اور ان کے عروج و زوال کا نقشہ بھی اسی کی چشمِ حقیقت شناس کے سامنے تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ تمدنوں، تہذیبوں اور مذہبوں کو کھن لگ چکا ہے۔ عشرت کے سامان ظلم سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ ظاہری حسن و جمال کی تہ میں ایک گہری بے دردی ہے۔ انسان ہر جگہ طرح طرح کے استبداد کا شکار ہیں۔ مذہب ہی استبداد کی وجہ سے انسانوں پر روحانی غلامی طاری ہے۔ اقتصاد کی لحاظ سے انسان بے بسی ہے۔ محنت کوئی کرتا ہے اور اس کا ثمر کوئی دوسرا کھاتا ہے۔ مروجہ خوار مروجہ خوری کہہ رہے ہیں اور انسانوں کو محتاج اور غلام بنا رہے ہیں۔ حکمران اپنے آپ کو لوگوں کی عزت اور جان و مال کا مالک سمجھتے ہیں۔ مذہب ہر جگہ جھٹک گیا ہے۔ لوگ رہبانیت کو روحانیت سمجھتے ہیں اور دوسری طرف اختیار اور مذہبی پیشوا حکمرانوں اور سربراہ داروں کی لوٹ کھسوٹ میں شریک اور معاون ہیں۔ مساوات انسانی کا تصور کسی انسان کے ذہن میں بھی نہیں گزرتا۔ مروجہ عورتوں کو مال اور مویشی کی طرح اپنی جائیداد سمجھتے ہیں۔ مذہبوں اور تہذیبوں نے انسانییت پر تذبذب کی عمر لگا رکھی ہے۔ جمہوریت کا علم کے دروازے جمہور پر بند ہیں اس مصلح نے اپنا مشن یہی قرار دیا کہ انسانوں کو ہر قسم کی غلامی اور استبداد سے آزاد کیا جائے اور ایک ایسا معاشرہ پیدا کیا جائے جس کی بنا حریت، عدالت اور رحمت پر قائم ہو۔ لوگوں کو صلح کا پیغام دیا جائے اور جو گروہ صلح جوئی اور اس نئے عادلانہ معاشرے کی راہ میں ہانکی ہوں اگر وہ تعلیم و تلقین سے راہ پر نہ آئیں تو ان کے خلاف ہر قسم کی قوت کو استعمال کیا جائے۔ انسانی معاشرے میں فتنوں کا سد باب کیا جائے۔ ضمیر کی آزادی کے لیے اگر ضرورت ہو تو جنگ کی جائے مگر دین کے معاملے میں کسی پر جبر نہ کیا جائے۔ نہ جبر خفی اور نہ جبر جلی۔ حکمرانوں کو یہ بتایا جائے کہ وہ قوم کے خادم ہیں اور حکومت کو ذاتی جلیب منفعت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ جو گروہ فتنے سے باز رہے وہ اپنے

عقائد پر اپنے انداز سے زندگی بسر کر سکتا ہے۔ ذمی کی جان و مال و آبرو کو مسلمان کی جان و مال اور آبرو کے برابر سمجھا جائے۔ قبیلوں، قوموں اور ملتوں میں سے قصب اور تفوق کے احساس کو دور کیا جائے۔ اور یہ اعلان کیا جائے کہ کسی عرب کو بحیثیت عرب کسی غیر عرب پر کوئی فوقیت حاصل نہیں، اور نہ ہی کوئی غیر عرب ملت بحیثیت ملت عربوں پر فائق ہے۔ انسانوں میں فرق صرف ہیرت اور کردار اور زندگی کے نصب العینوں کے تفاوت سے پیدا ہوتا ہے۔ کوئی گروہ نجات کا اجارہ دار نہیں۔ انسانوں کو یہ تہمتیں کی جائے کہ وہ تو ہم آفرینی اور اعجازِ ظہری کی بجائے اپنی فطرت اور خارجی فطرت کے مظاہر کا مطالعہ کریں۔

تمام مظاہر فطرت آیاتِ الہی ہیں اس لیے فطرت میں آئین کا مستلشی حقیقت میں خدا کا طالب ہے۔ کیونکہ خدا نے واحد ہی فطرت کی کثرت میں وحدت آفرین ہے۔ ہر فرد کے لیے ہر قسم کی ترقی کے مواقع ہیا کیے جائیں۔ معاشرہ دولت پیدا کرے لیکن اس کا نگران رہے کہ دولت ظلم سے پیدا نہ ہو، اور وہ چند افراد کے ہاتھوں میں گردش نہ کرتی رہے۔ قیصریت اور کسرامیت کا خاتمہ کیا جائے، لا قیصر ولا کسریٰ کا نعرہ بلند کیا جائے۔ اسلام نے انسانوں کو یقین دلایا کہ جو تمدن ان بنیادوں پر قائم ہو گا وہی انسانیت کا وقار قائم کرے گا۔ وہ انسان کے لیے لامتناہی ارتقاء کے دروازے کھول دے گا۔ چنانچہ انسانوں نے دیکھ لیا کہ یہ پیش گوئی سچی تھی۔ اسلام جب حجاز سے نکلا ہے تو اس کے پاس ایک نظریہ حیات کے سوا کچھ نہ تھا۔ نہ علوم نہ فنون نہ اعلیٰ درجے کے آلات نہ سامانِ عشرت نہ صنعتوں کے نظرافروزمونسے۔ بقول اقبالؒ؟

غیر یک بانگِ درا کچھ نہیں ساماں تیرا
اس بانگِ درا کے ساتھ یہ قافلہ ایسے تیز رفتاری سے چلا کہ مشرق اور مغرب

کے ڈانڈے مل گئے۔ مسلمان راستہ چلتے ہوئے منہزن قوموں کے علوم و فنون کو اپنا کم شدہ مال سمجھ کر اپنا تا چلا گیا۔ اس کے پاس ابتدا میں کچھ نہ تھا لیکن وہ جلد نوع انسان کے ہزار ہا سال کے ارتقاء میں حاصل کردہ علوم و فنون کا وارث ہو گیا اس نے اس دولت کو صرف بچایا اور اپنا یا ہی نہیں بلکہ اس کو بڑھایا۔ تمام علوم و فنون میں ایک نئی روح پھونکی جس سے ان کی ہیئت بدل گئی۔ ارسطو اور افلاطون سے بہتر مفکر پیدا کیے۔ اہرام فراغت اور پار تھینان سے بہتر تعمیریں کھڑی کیں، لیکن ان تعمیروں کا کارا اور جو نہ غلاموں کے خون سے نہیں گونڈھا گیا۔

لیکن افسوس ہے کہ یہ تہذیب اور یہ تمدن بھی جو حرکت کو برکت سمجھتا تھا اور ارتقاء کو شوق و خلاق تھا اور ایام سے جامد ہونا شروع ہو گیا۔ حکمرانوں کا استبداد بڑھ گیا اور وہ رعیت کے راعی نہ رہے۔ وہ خداؤں نے کاشت کاروں کو غلام بنایا اور وہیں کی یہ حالت ہوئی کہ:

حرم جو یاں ورے رامی پرستند

فقہاں دفترے رامی پرستند

عالمان دین نے یہودی اخبار کاروں سے اختیار کر لیا اور برہمنوں کی طرح طبقاتی تفرق کے جذبے کا شکار ہو گئے۔

ابتدائی صدیوں میں مسلمان فقہا تغیر حالات کے ساتھ ساتھ اسلامی قانون میں وسعت پیدا کرتے رہے لیکن بعد کے فقہاء میں اجتماع کی صلاحیت نہ رہی اور یہ یکارنا شروع کیا کہ اجتماع کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ جابر سلطانوں کے سامنے کلمہ حق کہتے واسے مفقود ہو گئے۔ علوم کی ترقی رک گئی۔ دین جامد ہو کر افسردہ و پرمردہ ہو گیا۔ حکمرانوں اور علمائے سوء نے مل کر جمہور کو جاہل اور بے بس کر دیا۔ ترقی کی مشعل ان کے دستِ شل سے گر گئی اور دوسروں نے اٹھالی:

بجھ کے شمع طبت پیضا پریشاں ہو گئی
اور دیا تہذیب حاضر کا فروزاں کر گئی
دور گردوں میں نمونے مینکڑوں تہذیب کے
پل کے گلے مادر ایام کی آغوش سے

اس وقت مسلمان پس ماندہ ہے۔ اس کے پاس اسبابِ حیات نہیں۔ علوم و فنون میں اور اصلاحِ معاشرت میں دوسری قومیں اس سے کوسوں دور نکل چکی ہیں۔ اب اس کے سوا چارہ نہیں کہ تہذیب کے اس تصور کا اچھا کیا جائے جو ہر قسم کی ترقی اور حریت کا ضامن تھا۔ دین کو اخلاقی اور معاشرتی اصلاح کا ذریعہ بنایا جائے۔ اسلام جن رجحانات کا امام تھا ان کو دوبارہ بروئے کار لایا جائے۔ دین کو عقائد کی فروغی جنگ سے پھڑپھڑایا جائے۔ انسانوں میں حقوق کے لحاظ سے وہ مساوات قائم کی جائے جس کا نمونہ رسول کریمؐ اور ان کے صحابہ کرامؓ نے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ تہذیب و تمدن کی بنا عدل و رحمت پر رکھی جائے۔ زندگی میں حسن و جمال پیدا کیا جائے۔ حصولِ علم کا جذبہ پیدا ہو اور انسانیت کا معیار زر و مال نہ ہو۔ گشتار نہ ہو بلکہ کردار ہو۔ اسلامی تہذیب کا تصور ایک لامتناہی ارتقاء ہے۔ حیات کا تصور ہے اس کی تکمیل کے لیے تقلید سے زیادہ تحقیق کی ضرورت ہے اور تحقیق سے زیادہ زندگی کو اس کے مطابق بنانے کی سعیِ بلیغ۔

بعض ذہنوں میں شاید یہ سوال ابھرے گا کہ اگر غیر مسلم قومیں بھی حیرت انگیز ترقی کر سکتی ہیں تو اسلام کی کیا ضرورت ہے اور اسلامی تہذیب میں کیا خصوصیت ایسی ہو گی جو اس کو دوسری تہذیبوں سے ممتاز کر سکے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انگریز ہم سے بہتر مسلمان ہیں۔ اسلامی صفات میں سے اگر ہمارے پاس پانچ فی صد ہی بسمربا یہ رہ گیا ہے تو انگریزوں کی زندگی میں پچاس فی صد موجود ہے۔ انگلستان میں چور بازاری نہیں۔ حاکموں میں رشوت ستانی نہیں۔ ہر فرد کو تعلیم اور ترقی کے مواقع حاصل ہیں۔ کمال درجے کی مذہبی رواداری موجود ہے۔ دین کے معاملے میں کوئی جبر نہیں۔ کسی شخص کو محض ذاتی اور مذہبی عقائد کی بنا پر نہ کوئی فوقیت حاصل ہے اور نہ زندگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ ہائل ہوتی ہے۔ مملکت نے ہر فرد کی تعلیم کا بیڑا اٹھایا ہے۔ مملکت ہر فرد کی صحت کی ضامن ہے۔ اسلامی ممالک میں کہیں اس وقت کوئی رفاہی حکومت نہیں۔ ہاں کہیں کہیں ابتدائی کوشش نظر آتی ہے۔ اثرائت کی خواہش

ہوں یا چینی، رفاہِ عام کے راستوں پر تیزی سے گامزن ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک گروہ کہتا ہے کہ ہم انگریزوں کو نمونہ سمجھ کر اپنی انفرادی اور اجتماعی اصلاح کی طرف قدم اٹھائیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ نہیں اشتراکیت اس سے بہتر رہے گی۔ افسوس یہ ہے کہ ہم ان زندہ تحریکوں اور تہذیبوں کے مقابلے میں عہدِ حاضر میں کسی اسلامی مملکت، یا معاشرے کو پیش نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس محض ایک نصب العین اور زاویہ نگاہ ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی جو ایک جمید عالم اور پختہ عقیدے کے مسلمان ہونے کے علاوہ ایک انقلاب پسند طبیعت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ اسٹالین سے جا ملے اور اسلامی تہذیب و تمدن کا ایک نصب العین خاکہ اس کے سامنے پیش کیا۔ سب کچھ سن کر اسٹالین نے پوچھا کہ کونسی اسلامی مملکت اس کو عملی جامہ پہنا رہی ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ عملاً اس تجربے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ کاربند تو اس پر اس وقت کوئی بھی نہیں۔ لیکن ہمارا ایمان اور مقصود حیات یہی ہے اس پر اسٹالین نے جواب دیا کہ جب کوئی قوم اس پر عمل کرے گی تو پھر ہم کوئی رائے قائم کریں گے۔ اگر اس کا جواب ہم یہ دیں کہ اصلی اسلام نے ابتداء میں ایک نمونہ پیش کیا تھا۔ اس سے ہمارے نصب العین کا اندازہ کر لیجئے تو سننے والا کہہ سکتا ہے کہ جو وہ سو برس قبل کے حالات اور موجودہ تقاضوں میں اتنا فرق پیدا ہو گیا ہے کہ اس نمانے میں اس تجربے کو دہرایا نہیں جاسکتا۔ تو یہ اعتراض ایک حد تک درست ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدیوں سے ہماری ترقی رُک گئی۔ ہم اسلام سے پیچھے ہٹتے گئے اور بعض دیگر اقوام اصلاحی کوششوں میں سرعت کے ساتھ ہم سے آگے نکلتی گئیں۔

قافلے دیکھو اور ان کی برق رفتاری بھی دیکھو

رہرو در ماندہ کی منزل سے ہزار کی بھی دیکھو

لیکن مایوسی کفر ہے۔ ملوثوں کا زوال و کمال ہوتا ہی رہتا ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہزاروں برس کی خفہ، رجعت پسند اور جامد قومیں یک بیک بیدار ہو کر اپنی کاپاپٹ

چکی ہیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ ہم ترقی کی دوڑ میں ہمیشہ کے لیے پس ماندہ رہیں۔ اب اولیں ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے نصیب المعین میں وضاحت پیدا کریں اور جدید زندگی کے حقائق کو نظر انداز نہ کریں۔ پہلے بھی ہم ستم ترقی یافتہ تہذیبوں اور تمدنوں کے ساتھ جھڑپا صفا اور دم ساکد کا عمل کیا تھا۔ اب بھی ہم کو دوسروں کے تجربوں سے فائدہ اٹھانا اور بہت سی باتوں میں ترقی یافتہ لوگوں کی شاگردی کرنا ہوگی۔ لیکن ہمارا نصب المعین اسلام نے متعین کر دیا ہے۔ اس کی ہم وضاحت نو کر سکتے ہیں اور زندگی پر اس کا نیا اطلاق بھی کر سکتے ہیں لیکن اس میں رد و بدل نہ ایما نا ہو سکتا ہے اور نہ عقلاً۔

اسلام اساساً ایمان باللہ اور خدمت خلق کا نام ہے۔ وہ انسانوں میں سے مصنوعی تقسیمیں مٹانا چاہتا ہے۔ وہ نسلی یا جغرافیائی یا لسانی قومیت کو زندگی کی اساس نہیں بنا سکتا۔ اسلام حریت اور مساوات کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ ہر قسم کے استبداد کو مٹانا چاہتا ہے۔ وہ انسانوں کو عدالت، رحمت، حکومت اور عفت کو جزو زندگی بنانے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ دولت اور قوت کو ذریعہ سمجھتا ہے، متصور و حیات قرار نہیں دیتا۔ اسلامی تہذیب کی بناء الحاد نہیں بلکہ توحید ہے۔ وہ زندگی میں طبعی، اخلاقی اور روحانی جمالی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ وہ ایک طرف رہبانیت اور دوسری طرف دنیا طلبی سے روکتا ہے۔ وہ زندگی کے تمام اچھے نصب العینوں کا جامع ہے۔ وہ غیر قوموں کے کمالات کو اپنانا بھی اپنی توہین نہیں سمجھتا۔ اگر اسلام یہی ہے تو زندگی کا کوئی نصب المعین جو انسانی زندگی کو بہتر بنا سکے، اس سے خارج نہیں ہو سکتا۔ ہمارا حال خراب ہے لیکن اگر ہمارا زاویہ نگاہ حقیقی اسلام کے مطابق ہو تو ہمارا مستقبل ہمارے ماضی سے بھی زیادہ درخشندہ ہو سکتا ہے۔

(جائیول، لاہور۔ جنوری ۱۹۵۵ء)

تعدد ازواج

ازدواجی زندگی کے متعلق قرآنی اور اسلامی زاویہ نگاہ کیا ہے یہ ایک نہایت اہم معاشرتی مسئلہ ہے اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس سے مسئلہ کے مختلف پہلو بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ تاہم موجودہ حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے جن امور کی توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے ان کو سوالیہ جواب کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

سوال : قرآن کریم کی تعلیم اس مسئلے کے متعلق کیا ہے ؟

جواب : کتاب حکیم میں تعدد ازدواج کے بارے میں دو تین آیات سے زیادہ نہیں ملتیں۔ چار تک نکاح کرنے کی اجازت ایک مخصوص صورت حال اور ایک مخصوص سماجی ابتری کے علاج کے طور پر پائی جاتی ہے۔ شروع میں رسول کریمؐ اور ان کے جان نثار پیروں اور صحابیوں کو دین کی حفاظت اور رفع فتنہ کے لیے جنگیں کرنی پڑیں۔ مسلمان مجاہدین تعداد میں کم تھے اور مخالفین کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ان جنگوں میں مسلمان مرد کثیر تعداد میں شہید ہوئے، بے کس اور بے بس ہو گئے۔ ان کی تعداد اس ابتدائی معاشرے کا ایک اہم اور حل طلب مسئلہ بن گیا۔ قرآن کریم میں تعدد ازدواج کی اجازت اسی مسئلے کے حل کے لیے دی گئی :

اگر تمہیں یہ خطرہ ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں میں تمہیں جو پسند آئیں ان سے دو دو تین تین چار چار سے نکاح کر لو۔ ہاں اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل و بین (عدل و بین) نہ کر سکو گے تو یہی ایک ہی

وان خفتم الا فقسطوا
فی الیتیم فانکموا ما طاب لکم
من النساء و منی و ثلاث و ربیع
فان خفتم الا تعدلوا فواحد
او ما مملکت ایما نکحکم ذلک

ادنی الا تحولوا۔ بیوی ہو یا پابندی ہو۔ یہ تمہیں نا انصافی سے بچانے کا قریب تر راستہ ہے۔

اس آیت کی رو سے یہ اجازت کوئی علی الاطلاق اجازت نہیں۔ قرآن کے مد نظر عدل اور رحم ہے اس لیے صاف طور پر کہہ دیا گیا کہ اس اجازت کا ناجائز استعمال نہیں ہونا چاہیے۔ یہ اجازت عدل کی خاطر ہے اور اگر عدل میں خلل آتا ہو تو پھر ایک ہی بیوی ہونی چاہیے۔ قرآن انسان کی جبلت اور اس کی نفسیات سے بے خبر نہیں، اس لیے یہ بھی واضح کر دیا کہ عدل کا مل نہایت دشوار چیز ہے۔ مال کی تقسیم بھی ایک سے زیادہ بیویوں کی مالی ضروریات میں عدل لازمی ہے اور ایک انصاف پسند انسان یہ کر بھی سکتا ہے۔ لیکن روائی قلبی میں مساوات انسانی اختیار سے باہر ہے لہذا خبردار رہو اور ایسا نہ ہونے پائے کہ طبیعت کو سب جھکا دیا جائے اور دوسری بیوی محروم و معلق رہ جائے۔

... فلا تمیلوا کل المیل فتنی دوہا کا معلقہ

ہذا تم ایک طرف اسنے نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو معلق بھوڑو

سوال: کیا اسلام اجازت دیتا ہے کہ ایک اچھی ٹھیلی صاحب اولاد بیوی کے ہوتے ہوئے کوئی شخص محض اپنی مالی استطاعت کی وجہ سے دوسرا یا تیسرا یا چوتھا نکاح کر لے؟

جواب: اگر کوئی شخص بغیر کسی شدید مجبوری یا ضرورت کے محض اپنے نفس و بدن کی تسکین و تفریح کے لیے ایسا کرتا ہے تو وہ اخلاقاً ایک ناجائز بات کرتا ہے۔ رسول کریمؐ کے اسوہ حسنہ کو لو کہ علی الاطلاق تقدوا ازواج سے جو از میں تو پیش کر دیتے ہیں لیکن اسوہ حسنہ کے اس قابل تو صیفت و تقلید پہلو کو نہیں دیکھتے کہ رسول کریمؐ کی طویل عاکی زندگی فقط ایک نیک حسن اسلام اور قدر شناس بیوی کے ساتھ بسر ہوئی جو عمر میں شوہر سے قریباً پندرہ سال بڑی تھیں۔ رسول کریمؐ کی تمام اولاد میں بائیس نامے واحد سب اسی ایک بیوی کے بطن سے ہوئی۔ یہ یقینی بات

ہے کہ اگر وہ رسول کریمؐ کی وفات تک زندہ رہتیں تو رسول کریمؐ اہم معاشرتی اور سیاسی ضرورتوں کے باوجود اسی ایک معمر زوجہ پر قناعت فرماتے۔

سوال: رسول کریمؐ کو امیر مملکت ہونے کے بعد متعدد نکاحوں کی کیوں ضرورت پیش آئی؟

جواب: ان نکاحوں پر ایک ایک کر کے نظر ڈالیے، ان میں سے کوئی بھی خواہش نفس کی شادی نہیں۔ اگر خواہش نفس کا اس میں ذرہ بھر بھی دخل ہوتا تو منتخب خوش رو، جوان، دوشیزگان کا ایک حرم جمع ہو جاتا، جیسا کہ بعد میں مسلمان سلاطین نے کیا۔ رسول کریمؐ کی تندرستی اور غیر معمولی قوت و صحت آخر تک قائم تھی۔ خدا اس پر عود فرمایا کہ ایک معمر بیوی سے اتنی اولادیں ہوئیں درجہ کی دس بارہ اعمات المؤمنین میں سے کوئی اولاد نہیں، کیا اس سے صاف نتیجہ نہیں نکلتا کہ یہ سب نکاح معاشرتی مجبوریوں کی بدلتے تھے، اور رسول کریمؐ اصلی عاقلی زندگی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ ختم کر چکے تھے۔

یہ بات کہ ایک اچھی متقویٰ، دیندار، صاحبِ اولاد بیوی کے ہوتے ہوئے مرد مومن کو نکاح ثانی کی نہیں سوچنی چاہیے اس سے بھی واضح ہوتی ہے کہ حضرت فاطمہ الزہراءؓ کی موجودگی میں جب حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ نے دوسرا نکاح کرنا چاہا تو رسول کریمؐ اس پر بہت براغزو ختم ہوئے۔ کسی کا یہ گمان کرنا کہ یہ اپنی بیوی پر سوکھ لاسنے کا معاملہ تھا۔ اس رسولؐ کے متعلق ناقابلِ عفو و گمانی ہے جس کے دل میں ادا و نواہی کے بارے میں شخصی جذبہ اور ذاتی مفاد مفقود تھا۔

سوال: کیا رسول کریمؐ کے سامنے ایک سے زیادہ نکاح نہیں کیے گئے مگر اس وقت مسلمانوں کو نہیں روکا گیا تو اب کیوں روکا جائے؟

جواب: اس کا جواب وہی ہے کہ ایک قلیل جماعت کو ایک طرف تینا فی اور بیوگان کو اپنی پناہ پر لینے کا سوال تھا، اور دوسری طرف اس ملت کی تعداد کو بڑھانا لازمی تھا جسے مسلسل جہاد میں مبتلا رہنا تھا۔ ایسی حالت میں ایسی قوم اگر تعدد ازدواج سے اپنی تعداد کو نہ بڑھائے تو وہ دنیا میں اپنا مشن پورا نہیں کر سکتی۔ ”تتناکھوا و

”لکھا شود“ نکاح کرو اور اپنی تعداد بڑھاؤ۔ اسی اہم ضرورت کے پیش نظر ایک اچھی ضرورت اور اچھا مشورہ تھا۔ نیا مشن لے کر اٹھنے والوں کو محض قلت تعداد کی وجہ سے مخالف قوتیں مغلوب کر لیتی ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسلام کی اصلی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کا اسوہ حسنہ سامنے موجود ہونے کی وجہ سے کوئی شخص بیویوں کے معاملے میں غیر عادل ہونے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔

سوال : آبادی کے معاملے میں پاکستان کی موجودہ صورت حال کیا ہے ؟

جواب : پاکستان کے پاس زمین کے دو خطے ہیں۔ مشرقی پاکستان کا خطہ رقبے میں بہت کم ہے اور اس تھوڑی سی زمین میں جو دریاؤں اور بھیلوں کی زد سے بچ گئی ہے، کوئی پانچ کروڑ انسان سمجھ ہو گئے ہیں۔ جن کے لیے معمولی خوراک اور تن و ٹھانگنے کا مسئلہ بھی حل کرنا دشوار ہے۔ چہ جائیکہ تعلیم و تہذیب و تمدن کے دوسرے تقاضے جو حقیقت میں انسانیت کے لازمی تقاضے ہیں پورے ہو سکیں۔ مغربی پاکستان میں رقبہ بہت زیادہ ہے لیکن سب سے بڑا حصہ یعنی بلوچستان پانچ لاکھ انسانوں کے لیے بھی اوسنے زمانہ حیات مہیا نہیں کر سکتا۔ اس خطے میں کوئی ساڑھے چار کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ ایک سال فصل خراب ہونے سے غیر مسلم اقوام کے آگے محض روٹی اور قوت لایموت کے لیے دست سوال دراز کرنا پڑتا ہے جو کسی غیرت مند قوم کے لیے نہایت شرم ناک بات معلوم ہوتی ہے۔ پورے پاکستان میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں کم ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ ایک عورت بھی ایک مرد کے حصے میں نہیں آتی۔ پاکستان جیسے ملکوں کی شدید ضرورت یہ ہے کہ آبادی کی افزونی کو کم کیا جائے۔ اسی وقت یہاں اس بحث میں بڑھنے کی ضرورت نہیں کہ اس مقصد کے لیے کیا جائز اور محقول طریقہ اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ بہر حال پاکستان کی حالت وہ نہیں ہے جو ابتدائے اسلام میں مسلمانوں کی حالت تھی، اس لیے ابتدا میں ازدواج کے معاملے میں جو مجوز یا اجازتیں یا ضرورتیں تھیں اور ان کے پیش نظر جو طریق عمل اختیار کیا گیا تھا وہ موجودہ حالت پر قابل اطلاق نہیں ہے۔

سوال : ازدوئے اسلام عائلی زندگی کی کونسی صورت حیات انسانی کے اقدار کو مد نظر رکھتے ہوئے قابل ترجیح ہوگی۔ شوہر، ایک زوجہ اور ان کی اولاد یا ایک سے زیادہ بیویوں والا گھرانہ ؟

جواب : فیملی لائف میں سکون و تسکین کا مدار کچھ عدل پر ہے اور کچھ باہمی محبت پر۔ عدل کی نسبت قرآن کریم کا فتویٰ ہے کہ کوشش کے باوجود بھی تعدد ازدواج میں اس فضیلت پر عمل کرنا نہایت درجہ دشوار ہے۔ باقی رہی محبت تو اس کے اندر رقابت کا جذبہ فطرت انسانی کا لازمہ معلوم ہوتا ہے۔ حیات انسانی کا وسیع تجربہ اس کا شاہد ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں باہم رقیب بلکہ دشمن ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے کوئی بیوی بھی پوری طرح شوہر کے ساتھ جذبہ وفا نہیں رکھتی۔ سو کن کا جلاپا اور سلکا پامشور ہے۔ شوہر کی زندگی ہی میں دو یا زائد بیویوں کی اولاد میں باہمی محبت نہیں ہوتی۔ اگر دشمنی تک نوبت نہ پہنچے تاہم بے کاٹنگی ضرور ہوتی ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر رشک و حسد کی آگ بھڑکتی یا سکتی ہے۔ یہ نصیحت کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے عملاً کچھ معنی نہیں رکھتی۔ اگر شوہر کوئی جائداد چھوڑ جائے تو تقسیم جائداد کا جھگڑا دو یا تین بیویوں اور ان کی اولادوں کو عدالت کے کھڑے پر سے جاکر کھڑا کرتا ہے۔ یہ قسم روزانہ عدالتوں میں پیش آتے ہیں اور وہاں خوب زہرا گلا اور بھوٹ بولا جاتا ہے۔ عدالت کا فیصلہ اگر عادلانہ بھی ہو تو بھی اس سے خصومت ختم نہیں ہوتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے ایک میاں اور ایک بیوی اور ان کی اولاد پر مشتمل ایک وحدت سنائی ہے۔ اس وحدت میں شرکت ایسا فساد پیدا کرتی ہے کہ خاندان کا سکون و اطمینان غارت ہو جاتا ہے۔

یہاں مجھے اپنے ایک بزرگ سے سنا ہوا ایک واقعہ یاد آگیا۔ یہ بزرگ تمام شہر لاہور میں نہایت درجہ ذہین اور باخبر انسان شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ لاہور میں ایک صاحب ثروت سادات کے گھرانے میں سے زیور چوری ہو گیا۔ کوٹوالی شہر نے بہت تحقیقات کی لیکن چور کا کہیں پتہ نہ چل سکتا تھا۔ یہ گھر چاندی طرف

سے محفوظ تھا اور پردے کی شدید پابندی کی وجہ سے کسی مرد ملازم کا اندر آنا جانا نہ تھا۔ آخر کوتوال نے اس بزرگ عاقل سے کہا کہ اس معاملے میں کھوج نکالنے کے لیے آپ کچھ اپنی عقل لگائیے۔ مرد عاقل نے سب قصہ سنا تو وہ بھی اس نتیجے پر پہنچے کہ باہر سے کسی چور کا اس گھر میں داخل ہو کر زمانہ گھر کے صندوق میں سے زیور نکال کر لے جانا اور وہ بھی اس طرح کہ گھر میں کسی کو آہٹ بھی نہ ملے نہ وہ بھی بحال معلوم ہوتا ہے۔ اس پر ایک بیک ان کا ذہن ایک دوسری جانب منتقل ہوا اور پوچھا کہ سید صاحب کی ایک بیوی ہے یا دو ہیں؟ کوتوال نے کہا کہ دو ہیں اور دونوں اسی گھر کے دو جھول میں رہتی ہیں۔ اس پر بزرگ نے کہا کہ چلو اس مکان پر مجھے اپنے ہمراہ لے چلو۔ وہاں پہنچنے پر کہا کہ مستورات کو کہیں ایک طرف کر دو۔ میں رمارے گھر میں پھر کر دیکھتا ہوں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ اس کے بعد کہا کہ مجھے ایک موٹا سا ڈنڈا چاہیے۔ کوتوال صاحب مسکرائے کہ کیوں صاحب کسی کی ہڈیاں توڑنے کا ارادہ ہے انہوں نے کہا کہ نہیں کچھ اور مقصد ہے۔ جس تک پولیس والوں کی عقل کی رسائی نہیں چنانچہ ایک موٹا سا ڈنڈا لیا گیا اور یہ بزرگ کوتوال صاحب کو ہمراہ لے کر اندر چلے۔ ہر گھر کے فرش اور دیواروں کو زور سے ٹھکراتا شروع کیا۔ یہاں تک کہ ایک دیوار سے کچھ ٹکھو کھلی سی آواز نکلی۔ کہا کہ کسی کو بلاؤ کہ تیشے سے دیوار کے اس حصے کو اکھاڑ دے۔ جب ایسا کیا گیا تو تمام زیور ایک صندوقچی میں رکھا ہوا اس میں سے برآمد ہوا۔ کوتوال صاحب ششدر رہ گئے اور پوچھا کہ یہ علم غیب آپ کو کہاں سے حاصل ہوا۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہ علم غیب نہیں بلکہ عقل حاضر ہے اور انسانی زندگی کا تجربہ ہے۔ کوتوال صاحب نے کہا کہ کچھ مزید تشریح کیجیے کہ ہم بھی اس فراست سے فیض یاب ہوں۔ چنانچہ اس بزرگ نے کہا کہ جب مجھے آپ سے یہ علم ہوا کہ گھر میں چور کا داخلہ محال ہے اور بیویاں دو ہیں تو اس نتیجے پر پہنچا کہ دو بیویاں مال کے معاملے میں کبھی شوہر کی وفادار نہیں ہوتیں اور ہر ایک چاہتی ہے کہ کسی نہ کسی جیلے بہانے سے اس سے جو کچھ حاصل ہو سکے کہ لیا جائے۔ میں سمجھ گیا کہ جس بیوی کا زیور چرایا گیا ہے اس کی چور

وہ خود ہی ہے اور زیور اس لیے چھپایا ہے کہ شوہر مجبور ہو کر اتنا زیور اس کے لیے دوبارہ نہیں کرے۔ چونکہ شدید پردہ دار عورت ہے، اس نے ضرور گھر کے اندر ہی چھپایا ہو گا اور گھر کے اندر چھپانے کی قدیم ترکیب دیوار میں خلا کر کے مال چھپاتا ہے۔ کو تو ال نے کہا کہ حضرت ہم تو یونہی کو تو ال بنے بیٹھے ہیں حقیقت میں کو تو ال شہر تو آپ کو ہونا چاہیے۔ یہ کوئی افسانہ نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے اور یہ بزرگ میرے خاندان کے ایک مشہور صاحبِ فراست شخص تھے اور انھوں نے خود یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا۔ غرض کہ ایک سے زیادہ بیویوں کا گھرانہ فساد کا ایک سرچشمہ ہوتا ہے۔ عام طور پر اخلاقِ حسنہ اس میں سوخت ہو جاتے ہیں اور نئے جذبات ابھر پڑتے ہیں۔ عدل و انصاف معدوم، رحم اور محبت مفقود، ہر وقت طعن و تشنیع، سازش کا بازار گرم ہر ایک کا ناک میں دم۔ زندگی میں بھی فساد اور مرنے کے بعد بھی فساد۔

سوال: اگر آپ کا عقیدہ یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور تعدد ازواج میں انسان کی فطرت کا یہ بھونڈا نقشہ ہے تو جہاں اسلام نے اور خراب رسوم و شعائر کی بیخ کنی کی وہاں اسے بھی ایک قلمِ ممنوع کیوں نہ قرار دیا کہ کسی حالت میں کسی شخص کو دوسرا نکاح کرنے کی اجازت نہیں۔ یہ طرزِ بیان کیوں اختیار کیا کہ ایک سے زائد بیویاں کر سکتے ہو بشرطیکہ عدل کو ملحوظ خاطر رکھو، اگرچہ عدل اس معاملے میں سب سے حد و شمار چیز ہے۔

جواب: یہ حد فی حد درست ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اسی لیے مخصوص اور مستثنیٰ حالات کے لیے گنجائش چھوڑی ہے۔ بعض اوقات جائز طور پر حالات ایسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ چارہ کاری ہو کہ ایک شخص دوسرا یا تیسرا نکاح کر سکے۔ اسلام کی تعلیم کسی ایک سوسائٹی کے لیے نہیں۔ جنگلی اور صحرائی قبائل سے لے کر نہایت ترقی یافتہ تمدن تک کی اقوامِ طلوعِ اسلام سے لے کر آج تک اسلام قبول کرتی چلی آئی ہیں۔ پھر ان اقوام کو مختلف ادوار میں ہر قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اگر اسلام کے قوانین میں کوئی لچک نہ ہوتی تو وہ مختلف زمانوں میں مختلف حالات اور مختلف

مذاہب کی اقوام پر عادی نہ ہو سکتا تھا۔ نہایت ترقی یافتہ اور مہذب اقوام کے افراد کی زندگی میں بھی ایسے حالات پیدا ہو سکتے ہیں کہ ان کی مشکل کو نکاح ثانی ہی حل کر سکے۔ اور اگر نکاح ثانی کو ممنوع قرار دیا جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی وہ اس سے بہت زیادہ جانگداز اور روح فرسا ہوں گی جو نکاح ثانی میں پیش آ سکتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم سے قبل جرمنی کی تہذیب اور اس کا تمدن اس کے علوم اور اس کے فنون درجہ کمال کو پہنچ چکے تھے۔ خوف ناک جنگ اور پھر شکست نے تہذیب و تمدن کا سب سا پنجا بگاڑ دیا اور اس متمدن قوم نے ہٹلر جیسے متعصب، مجنون اور بر خود غلط انسان کو اپنا رہبر اور نجات دہندہ تسلیم کر لیا، لیکن انسانی زندگی کی پیچیدگیاں کچھ ایسی ہیں کہ یہ مجنون بھی بعض اوقات ٹھکانے کی بات کہہ جاتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے انتقام کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنی قوم کو انتقام کے لیے اعلانِ شروع کیا۔ اس وقت کی المانوی حکومت نے اس کو قید کر دیا۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنی کتاب ”مائن کیمپ“ (میری پکار) لکھی۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ :

”بہرمنوں کے نسلی اسلاف میں تعدد ازدواج کا رواج تھا اور وہ ان کے حالات میں بہت بڑھ چکا تھا۔ اب بھی اس جنگ کے بعد اس قوم کے ایسے حالات ہو گئے ہیں کہ تعدد ازدواج کو جائز قرار دینا پڑے گا، یا کم از کم یہ کہ نا پڑے گا کہ نئے نکاحی اولاد کے ماتھے پر سے حرامی ہونے کا کٹک کاٹیا کاٹا دیا جائے۔ جو بچہ اس قوم میں پیدا ہو وہ حلالی ہی کا شمار کیا جائے۔“ راقم الحروف بھی اس زمانے میں کوئی تین سال تک فلسفے کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی میں رہا۔ میں جس گھر میں رہتا تھا اس کی مالکہ ایک نہایت شریف النفس، مہذب اور تعلیم یافتہ خاتون تھیں۔ اور مذہبی مسائل پر بھی آزادی سے سوچنے کی عادی تھیں۔ ایک روز اس گھر میں مسلمانوں کے تعدد ازدواج پر

کھشت کو ہوئی۔ میں نے اس خاتون سے کہا کہ میں نے جو تمہارے سے معاشرے کا حال دیکھا ہے اس کے مد نظر میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ان عورتوں کی جو سڑکوں پر اور مکانوں میں عصمت فروشی کرتی پھرتی ہیں، کیا تعداد ہوگی۔ اس نے کہا کہ لاکھوں کی تعداد میں ایسی عورتیں ہیں اور وہ ایسی ہیں جن کو کوئی شوہر نصیب نہیں ہو سکتا۔ میں نے پوچھا کہ اگر ان کو بعض لوگ دوسری بیوی بنا کر ان کے نان و نفقہ کا ذمہ لیں اور ان کی اولاد حرامی ہونے سے بچ جائے اور معاشرے میں ان کو ایک معزز مقام مل جائے اگرچہ وہ ہر حیثیت سے ایسا طمانیت بخش نہ ہو جو ایک میاں اور ایک بیوی کی حالت میں ہوتا ہے تو تمہاری اس کے متعلق کیا رائے ہوگی۔ اس خاتون نے جواب دیا کہ دوسری جائز بیوی بن کر ان کی حالت ان کی موجودہ کس مہر سی اور بد اخلاقی سے بدرجہا افضل ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ ایسی ہی صورتوں کے لیے اسلام نے اپنے قانون میں گنجائش رکھی تھی۔ تمہاری مغربی اقوام کو ایک زوجگی کے غلط کلیسیائی قانون نے بڑی مصیبت میں مبتلا کر دیا ہے۔ مغرب کے ہر ملک میں تاجائز بچوں کے اعداد و شمار شائع ہوتے رہتے ہیں۔ امریکہ میں بھی یہی حال ہے۔ ان کے کے خطباتی دوسے میں مجھ سے اکثر تعداد ازدواج کی بابت دریافت کیا گیا۔ میں نے جواب دیا کہ جس اسلامی ملک سے میں آیا ہوں سو میں ایک گھرانہ مشکل سے ایسا ہو گا جس میں دو بیویاں ہوں لیکن اس اجازت کی وجہ سے ہماری قوم ایک بڑی آفت سے بچ گئی ہے۔ یہاں سوسائٹی میں حرامی بچے لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں تو کیا سینکڑوں کی تعداد میں بھی نہیں ملتے۔ لاکھ دو لاکھ کے شہر میں اگر دو چار ایسے ہوتے ہیں انھیں اٹوٹھا سمجھ کر تمام شہر میں ان کا چرچا ہوتا ہے۔ اسلام نے خاص حالت میں نکاح ثانی کی اجازت دے کر معصوم بچوں پر کس قدر احسان کیا ہے کہ ان کو حرامی ہونے کی تہمت سے بچا لیا ہے۔

سوال: کون سے موجبات یا محرکات ایسے ہو سکتے ہیں جو نکاح ثانی کے لیے جائز شمار ہو سکیں؟

جواب: مثلاً ایک شخص اولاد کا خواہش مند ہے جو ایک فطری اور قابل احترام جذبہ ہے اور یہ بات طبی معائنہ سے ثابت ہو جائے کہ اس کی بیوی کے ہاں اولاد نہیں ہو سکتی یا اس کی بیوی کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے جس کی وجہ سے وہ حقوق زوجیت یا اموست ادا نہیں کر سکتی۔

سوال: اگر جیسٹ فی لحاظ سے کوئی عیب یا نقص نہ ہو لیکن مزاجوں اور طبیعتوں میں ایسا اختلاف ہو کہ زندگی بے لطف ہو جائے تو کیا ایسی حالت میں مرد کو کوئی رکاوٹ ہونی چاہیے کہ وہ کوئی دوسری من پسند بیوی تلاش کر لے؟

جواب: ایسی حالت میں پہلی بیوی کو طلاق دینے کا اسے حق حاصل ہے۔ لیکن اگر شوہر طلاق نہ دینا چاہے اور بیوی طلاق نہ لینا چاہے تو اس صورت میں پہلی بیوی کا معقول اور مناسب نان نفقہ اور اس کے بچوں کی پرورش کا شوہر ذمہ دار ہے۔ لیکن دوسری کو پسند کر کے پہلی بیوی کو متعلق اور بے بس رکھنے کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

سوال: کیا کسی ایسے شخص کو جو کسی نامعقول وجہ سے محض خواہش نفس یا ذوق تنوع سے دوسری شادی کرنے پر آمادہ ہو، اسلامی شریعت روک نہیں سکتی؟

جواب: ہاں از روئے شرع یا بذریعہ عدالت اسے روک نہیں سکتے۔ لیکن اس کو پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے ساتھ عدل کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ سوال: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ عام طور پر دوسری شادی کرنے والے پہلی بیوی اور بچوں کے ساتھ عادلانہ سلوک نہیں کرتے اس لیے کیا ایک اسلامی مملکت

میں یہ جائز بلکہ لازمی نہیں ہونا چاہیے کہ دوسری شادی کرنے والا عدالت میں درخواست دے اور عدالت میں اپنی پہلی بیوی اور بچے لے جائے جائیں۔ ان کی شکایات اور تقاضے بھی سنے جائیں۔ سب کچھ کہنے سننے کے بعد اگر ایک شوہر دوسری شادی کے ارادے سے باز نہ آئے تو عدالت پہلی بیوی اور بچوں کے گزارے کا معقول انتظام کرے، اور حکم صادر کرے کہ اپنی آمدنی میں سے تمہیں اس قدر ان کو دینا پڑے گا، اور ادا نہ کرنے پر تمہارے خلاف عدالت میں چارہ جوئی ہو سکے گی؟

جواب: ہاں چونکہ عام طور پر نکاح ثانی کرنے والے اکثر مرد خود اپنے ایمان اور ضمیر سے عدل کو قائم نہیں رکھتے اس لیے اس معاملے میں عدالت کی وساطت اس عدل کے لیے لازمی ہے جو نکاح ثانی میں ایک اسلامی فریضہ ہے۔

سوال: کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ایسے مسلمان مردوں کی جو نکاح ثانی کرنا چاہتے ہیں عام ایمانی اور اخلاقی حالت ایسی ہوتی ہے کہ اگر ان کو عدالت میں پیش ہونے پر مجبور کیا جائے اور قانوناً ان کی آمدنی کی عادلانہ تقسیم عدالت کی وساطت سے ہوتی نظر آئے تو وہ آسان راستہ اختیار کریں اور پہلی بیوی کو طلاق ہی دے دیں۔ یہ جو اسی کندھول سے اٹھا کر پھینک دیں۔ نہ رہے بالنس اور نہ بچہ باندھری مسلمان مرد کو طلاق دینے سے کون روک سکتا ہے۔ ایسی حالت میں عورت کے لیے دونوں صورتوں میں کھاٹا ہی کھاٹا ہے۔ اگر وہ اسے عدل پر مجبور کرتی ہے تو غلامند طلاق دے دیتا ہے۔ طلاق کی صورت میں بے چاری عورت کی بے کسی میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کیا وہ بہتر نہیں سمجھے گی کہ عدالت کی وساطت کے بغیر اگر غیر عادلانہ گزارا ہی ملتا رہے تو غنیمت ہے۔ تو کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ مرد اگر ظلم پر آمادہ ہو تو موجودہ صورت میں عورت کے لیے کوئی راہ نجات نہیں۔ عورتوں کی یہ بے بسی اور بے کسی کیوں ہے، کیا فطرت نے ان کو بے بس بنایا ہے یا انسانی

معاشرے نے ان کی ایسی حالت کر دی ہے؟

جواب: فطرت اور معاشرہ دونوں نے مل کر اس کی بے بسی میں اضافہ کر دیا ہے۔

سوال: کیا اسلام نے اس صنفِ نازک کی کوئی حمایت نہیں کی اور اس کی فطری بے بسی کو کم کرنے کی کوشش نہیں کی؟

جواب: اسلام نے عورت کی حمایت میں اتنا کچھ کیا کہ بہت ترقی یافتہ اور مہذب ممالک نے بھی اچھی تک عورتوں کی اتنی سچی شناسی نہیں کی۔ اسلام سے قبل عورت مملوک تھی۔ اسلام نے اس کو صاحبہ ملکیت بنا دیا۔ وراثت میں اس کو حصہ دلوا دیا۔ اس کو اپنے مال کا بلا شرکتِ شوہر مالک اور مختار بنایا۔ نکاح کے وقت اس کو مہر کا سحق دار بنایا۔ لیکن عملاً کچھ فقہیوں نے اور کچھ عام مسلمانوں نے ان کے حقوق کو سوخت کر دیا۔ ان کو گھروں میں جبرموں اور قیدیوں کی طرح بند کر دیا۔ ان کی نقل و حرکت پر شدید قدغین لگا دیں۔ ان کو زندگی کے تمام مشاغل اور کاروبار سے عملاً بے دخل کر دیا۔ اس ظلم میں انگریزوں کی قائم کردہ عدالتوں اور محکموں نے اور اضافہ کیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ نہ وہ وارثوں سے اپنا ورثہ لے سکے اور نہ ظالم شوہر سے چھٹکارا حاصل کر سکے، سو اس کے کہ وہ دین اسلام سے خارج ہو کر مرتد ہو جائے۔ چنانچہ بے شمار عورتیں اسی عذاب میں مبتلا ہوئیں۔ ایسی عدالتوں میں اگر کوئی غریب عورت چارہ بھائی کرنا چاہے تو برسوں میں اس کے قضیہ کا فیصلہ نہ ہو۔ بعض اسلامی ممالک میں عورتوں کے حقوق کے معاملے میں شرعی عدالتیں زیادہ مسرعت سے اور زیادہ عدل سے کام لیتی ہیں۔ ازدواجی زندگی کے قضیہ دو ایک پیشیوں میں طے ہو جاتے ہیں۔ بیوی اور بچوں کے نان و نفقہ کا قصہ ہو یا طلاق و خلع کا معاملہ، چند روز کے اندر فیصلہ ہو جاتا ہے۔ یہاں یہ حالت ہے

کہ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کا بھر کس نکل جاتا ہے۔ وکیلوں کی فیس اور عدالت کے خرچے ان کے مالی ذرائع کو دیکھ کر کی طرح چاٹ جاتے ہیں، لیکن مہر اور خلع اور وراثت کا جھگڑا ایک قدم آگے نہیں سرکتا۔ آخر میں جو کچھ فیصلہ ہوتا ہے وہ بھی اسلامی شریعت کے مطابق نہیں ہوتا بلکہ اینگلو محمدن لاس کے مطابق ہوتا ہے۔ جو فقہ کی ایک نہایت جامد شکل ہے۔ اس کی شدید ضرورت ہے کہ فقہی مسائل پر ایک غائر نظر ڈالی جائے اور روح اسلام کے مطابق ان کی نئی تشکیل کی جائے۔

مہر کا معاملہ ایک مضحکہ خیز فرضی قصہ بن گیا ہے۔ میاں کی جیب میں دھری نہیں کہیں سے قرض لے کر شادی فرما رہے ہیں۔ اور بیس بچیں، بچاس ہزار مہر لکھ دیتے ہیں۔ نہ کسی کا لینے کا ارادہ نہ دینے کا ارادہ۔ کاغذ پر نصف مؤجل اور نصف معجل۔ لیکن حقیقت میں نہ ٹکا نقد نہ اوصار۔ ہاں اگر ناجاتی ہو جائے تو ایک لاطا کی طویل مقدمہ بازی کی گنجائش نکل آتی ہے۔ اگر زوجہ کو حسب حیثیت شوہر معقول مہر نقد مل جائے اور وراثت کے معاملے میں بھی اس کی حق تلفی نہ ہو اور وہ اپنے مالی سے کچھ منافع پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے علاوہ ہر عورت کچھ علم و ہنر سیکھے جو بوقت ضرورت اس کے کام آئے اور اس کی جائز آزادی پر ناجائز پابندیاں نہ لگائی جائیں تو صحیح اسلام کے حدود کے اندر ہی اس کی بے بسی بہت کچھ رفع ہو سکتی ہے۔ لیکن موجودہ حالت میں نہ معاشرہ اس کی مدد کرتا ہے نہ جامد فقہ اس کی مدد کرتی ہے اور نہ عدالتیں اس کی وادری کرتی ہیں۔ طلاق کا سد باب کرنے کے لیے اسلام نے جو معاشرتی، نفسیاتی اور اخلاقی ذرائع استعمال کرنے کی تلقین کی تھی اس کو برطرف کر کے اب اسلامی طلاق یہی رہ گئی ہے کہ شوہر صاحب بگڑے یا انھیں کوئی نیا شوق چرایا اور انھوں نے ایک دو تین کر کے بیوی کو بے یار و مددگار مرثک پر ڈال دیا۔ ان تمام حرکتوں نے مسلمانوں کو ازدواج کے بارے میں ایسا بدنام کیا ہے کہ باہر کی دنیا میں کوئی یہ سنتے اور

باور کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا کہ اصلی نظام عورت کی حمایت کا ایک لاثانی نظام تھا۔
 سوال: کیا یہ بات صحیح نہیں کہ اسلام کی تعلیم میں کچھ رجحانات اور میلانات تھے جو اس وقت کے مجازی تمدن میں فقط ایک حد تک پورے ہو سکتے تھے اور ان کی تکمیل، تہذیب و تمدن کے طویل ارتقا کے بعد ہی ہو سکتی تھی۔ مثلاً غلامی ہی کو لیجیے۔
 اس دور میں اعلیٰ اور ادنیٰ تمام تمدنوں میں غلامی معاشی نظام کا ایک جزو لاینفک تھی اس دور میں کوئی بڑے سے بڑا مصلح اور پیغمبر بھی کسی فوری فرمان سے اس کو منسوخ نہ کر سکتا تھا۔ کیونکہ کوئی متبادل نظام فوراً اس وقت اس کی جگہ نہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ اسلام نے اس تدریجی آدم کو بتدریج منسوخ کرنے کی راہیں سمجھائیں، اور جب تک کہ یہ کلیتہً منسوخ نہ ہو، تب تک عدل و رحم کی تلقین کرنے کے علاوہ شریعت میں بھی غلاموں کے اساسی انسانی حقوق کو محفوظ کرنے کے وہ وسائل بتائے جو اس وقت بھی قابلِ عمل ہو سکتے تھے۔ اصل مقصد اور نصب العین یہ تھا کہ یہ بیع و رسم رفتہ رفتہ مرٹ جائے اور انسانی دنیا فقط احرار کی دنیا رہ جائے گویا غلاموں کو رکھنے کی اجازت ایک ہنگامی اجازت تھی جو بہت سی عادلانہ شرائط کے ساتھ مشروط کر دی گئی تھی۔ کیا اس زمانے میں تعدد ازدواج کی اجازت کو اسی پر قیاس نہ کیا جائے جس طرح غلامی کا تمام دنیا میں منسوخ کر دینا منشاء اسلام کے خلاف نہیں بلکہ عین اس کے تقاضوں کے مطابق ہے، کیا قانوناً تعدد ازدواج کو ناجائز قرار دینا نصب العین کی طرف ایک اہم اقدام نہیں ہو سکتا؟

جواب: آپ کا انداز نگاہ اسلام کے متعلق درست ہے لیکن غلامی اور تعدد ازدواج میں ایک فرق ہے جس کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ غلامی کے منٹ جانے سے تمام نوع انسان کو ہر حالت میں فائدہ ہے کیونکہ غلامی انسانیت کے ایک بنیادی حق حریت میں حائل تھی، لیکن دوسری شادی کی اجازت بعض مخصوص حالات

میں خود انسانیت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے باقی رہنی چاہیے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اگر اس اجازت کو قانوناً روک دیا جائے تو کسی جائز ضرورت سے بھی دوسری شادی کرنے والا پہلی کو طلاق دینے پر مجبور ہو جائے گا خواہ وہ اس فراق کا آرزو مند نہ ہو، اور نہ ہی بیوی علیحدہ ہونے پر راضی۔ بعض حالتوں میں پہلی بیوی کو طلاق دینا اس کو بالکل بے سہارا چھوڑ دے گا۔ کیونکہ زیادہ تر پہلی بیویاں ایسی ہی ہوں گی جو نہ دوسرا نکاح کر سکتی ہیں اور نہ آزاد می سے کچھ روزگار پیدا کر سکتی ہیں۔ تمدن کے اعلیٰ اور ادنیٰ تمام مدارج میں کہیں کہیں نکاح ثانی کی اجازت کسی مشکل کا ایک جائز حل ہو سکتی ہے۔ ایک مثال اعلیٰ تمدن سے لیجیے اور ایک ادنیٰ تمدن سے۔ پولین بونا پارٹ ایک غریب آدمی کا بیٹا اپنی غیر معمولی ہمت اور فراست سے تمام یورپ کا شہنشاہ ہو گیا۔ لیکن یورپ کے مغلوب شاہی خاندان اس کو نو دولت سمجھ کر دل میں اس سے نفرت کرتے تھے۔ اسی کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ اگر کسی شاہی گھرانے سے ازدواجی تعلق پیدا کرے تو یورپ کی ایک اہم گریباست میں اس کو بڑا فائدہ پہنچ سکتا ہے وہ اپنی پہلی بیوی سے محبت کرتا تھا اور اسے الگ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن کلیسا کی عیسائیت بیک وقت دو بیویاں رکھنے میں مانع تھی۔ لازماً اس بے چاری کو طلاق دینا پڑی۔ اس کے سوانح میں لکھا ہے کہ طلاق کے وقت میاں اور بیوی دونوں کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ یہ اعلیٰ تمدن میں ایک اہم سیاسی ضرورت کے شدید تقاضے کی مثال ہے۔ پولین جیسے انسان کے ساتھ ساتھ رسولِ اکرم کا ذکر زبان پر لانا سوج ادب معلوم ہوتا ہے لیکن ایک اہم مسئلے میں اظہارِ حقیقت کو روکنا بھی جائز نہیں۔ چنانچہ اس امر کی طرف اشارہ کرنا لازمی ہے کہ رسولِ اکرم کے بعض نکاح بھی خاندانوں اور قبائل کو متحد کرنے کے تقاضے سے عمل میں آئے۔ اس زمانے کے مزاج کے مطابق یہ بلند مقصد اسی انداز سے پورا ہو سکتا تھا۔

اب ایک مثال ادنیٰ ترین تمدن اور معاشرت سے لیجئے۔ افریقہ کے ایک مروجہ خور و حشی قبیلے میں ایک پادری نے عیسائیت کی تبلیغ کی۔ ایک مروجہ سردار کو عیسائیت پسند آگئی اور وہ باقاعدہ بیعت کر گیا۔ اس کی بہت کچھ اخلاقی اصلاح ہو گئی اور کلیسا کے بہت سے شعائر میں وہ خلوص سے حصہ لینے لگا۔ عیسائیت کے لحاظ سے ایک غفل اس میں رہ گیا تھا جسے وہ آسانی سے رفع نہ کر سکتا تھا۔ پادری صاحب اس کو برابر کہتے رہتے کہ دو بیویوں کا رکھنا شدید گنہ گاری ہے کیونکہ یہ زنا کے مرادف ہے۔ اس کو اپنی دونوں بیویاں پسند تھیں مگر ایک سے کسی قدر زیادہ لگاؤ تھا، اور دوسری سے مقابلہ کم۔ تبلیغ کی مسلسل زبردستی کا آخر اس پر اثر ہوا، اور اس نے مصمم ارادہ کر لیا کہ باحسرت و یاس آخر ایک بیوی سے اپنا چھٹکارا کر آئے۔ چنانچہ ایک روز اس نے پادری صاحب سے کہا کہ میں نے آخر کار آپ کی نصیحت پر عمل کر ہی لیا ہے اور اب فقط ایک ہی بیوی رکھی ہے۔ پادری نے پوچھا کہ دوسری کو کیا کیا۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے اس کو کھالیا ہے۔ اب دیکھیے کہ امتناع تعدد ازواج نے اس سے کیا ظلم کرایا۔ اس کی دینی ہستی و حشت اور عادت پھر الجھرائی۔ اگر عیسوی قانون انسان کی فطرت کے مطابق ہوتا اور تمام قسم کے حالات پر حاوی ہوتا تو عیسائی قانون سے تو اس ظلم کی ضرورت پیش نہ آتی۔ غرض متمدن فرنگ کا شاہنشاہ اور فاتح پولین ہو، یا دور و حشت کا انسان سب کی زندگی میں ایسے حالات پیش آسکتے ہیں جہاں دوسری بیوی رکھنا مناسب اور مستحسن ہو اور پہلی بیوی پر ظلم ناروا کی ضرورت پیش نہ آئے۔ لہذا اسلام اور انسانیت دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ مخصوص حالات کے لیے یہ اجازت باقی رہے۔ قرآن جو عدل پر بے حد زور دیتا ہے اور پھر یہ کہتا ہے کہ اس معاملے میں عدل نہایت ہی دشوار چیز ہے، لہذا عام حالات میں انسان ایک ہی بہر قناعت کر لیں تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ عام حالات میں عام انسانوں کے لیے وحدت ازواج ہی کو قرین عدل سمجھتا ہے۔ محض لذت نفس کے لیے (جو حقیقت میں تعدد ازواج سے حاصل نہیں ہوتی) کسی مسلمان کا پہلی بیوی اور پہلی اولاد کی زندگی میں

خلل ڈالنا اسلام کے مقصد اور اس کے نصب العین کے منافی ہے۔

سوال: جو لوگ خواہ مخواہ دوسری شادی پر تل جاتے ہیں کیا از روئے شرع ایسے لوگوں کو اس فعل کے ارتکاب سے روکا نہیں جاسکتا؟

جواب: محض قانون کے ذریعہ سے ایسے شخص کو روکنا لا حاصل ہو گا۔ البتہ شرعی عدالت پہلی بیوی اور اس کی اولاد کے ساتھ معاشی انصاف پر اس کو مجبور کر سکتی ہے۔

سوال: میں پھر اپنا پہلا سوال دہراتا ہوں کہ عدل سے گریز کا راستہ اگر وہ شخص یہ نکالے کہ پہلی کو طلاق دے دے تو طلاق سے تو اس کو عدالت نہیں روک سکتی۔ طلاق کے بعد پہلی بیوی کیا کرے گی۔ وہ معاشی وسائل سے مطلقاً محروم ہو جائے گی۔ وہ مہر تو حاصل کر سکتی ہے لیکن خالی مہر پر کتنے دن بسر کر سکتی ہے؟

جواب: حقیقت یہ ہے کہ محض قانون اور عدالتیں کسی انسان کو مومن اور عادل نہیں بنا سکتیں جب تک مسلمانوں میں حقیقی اسلام اور حقیقی ایمان نہیں ہو گا، ان کو ظلم و جہل سے ہٹانا ناممکن ہے۔

سوال: تو پھر آپ کا مطلب یہ ہے کہ اس بیماری کو لا علاج سمجھ کر رفع مرض کے لیے کچھ نہ کیا جائے؟

جواب: نہیں، اصلاح عمل سے مایوس ہو کر معاشرے کو اس کی حالت زبوں میں پھوڑ دینا کم ہمتی کا کام ہے۔ جہاں تک قانون سے علاج ہو سکتا ہے وہ ضرور کرنا چاہیے۔ لیکن کسی مسلمان کو اسلامی شریعت کے بدلنے کی جرأت یا حماقت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اسلامی شریعت کے بنیادی اور قرآنی اصول حکمت بالغہ پر مبنی ہیں ان کو سمجھنے اور ان پر خلوص سے عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا یہ شریعت کے منافی ہو گا کہ دوسری شادی کرنے کا آرزو مند کسی شریعت کی عدالت میں ایک درخواست دے تاکہ اجازت دینے سے پہلے عدالت شریعت کے تمام پہلوؤں کو اس پر واضح کر دے اور اگر عدلیہ میں خلل آنے کا امکان

ہو تو اس کے سد باب کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں اس کی پہلی بیوی اور بچوں کو بھی عدالت میں حاضر کیا جائے تاکہ وہ بھی اپنا نقطہ نظر دل کھلی کر پیش کر سکیں؟

جواب: ایسا کرنا شریعت کے ہرگز منافی نہ ہو گا بلکہ اسلام کے مقاصد کے عین مطابق ہو گا۔ اس کا احتمال ہے کہ محض اتنی سی رکاوٹ اور جواب دہی سے کبیر اگر بعض عاقبت نا اندیش مرد اس سے باز آجائیں۔ دوسری شادی کا اتنا ہی حکم عدالت صادر نہیں کر سکتی۔ لیکن جہاں تک ہو سکے عدل پر مجبور کر سکتی ہے۔ میں پھر اپنی تجویز کو دہراتا ہوں کہ ایسے معاملات کے لیے شرعی عدالتیں الگ قائم ہونی چاہئیں کیونکہ عام عدالتیں جن میں ایک معمولی قصبہ برسوں و کیلوں کی جیلہ گیری، ججوں کے تساہل اور انگریزی قانون کی رکاوٹوں کی وجہ سے اٹکا اور لٹکا رہتا ہے اس کام کو سرعت اور خوبی کے ساتھ انجام نہیں دے سکتیں۔ ایسی عدالتوں میں عورتوں کو بھی بطور ایسیر یا مشیر شریک کیا جاسکتا ہے۔

سوال: کیا ان خرابیوں کا کوئی سوشل علاج نہیں ہو سکتا؟

جواب: سوشل علاج بہت کچھ کارگر ہو سکتا ہے۔ مثلاً یہ کہ عورتیں ایسی پنشنیں اور برادریاں بنائیں جن میں ہر عورت یہ حلف اٹھائے کہ کوئی عورت یا کوئی بیٹی ایسے شخص کے نکاح میں نہیں دی جائے گی جو معقول و مجبور کے بغیر دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہو۔ جو نامعقول عورت ایسے نامعقول شوہر سے نکاح کرے تمام سوسائٹی اس کا بایکھاٹ کر دے۔ جو مرد ناجائز تعدد ازواج کو سوسائٹی سے مشائخا چاہتے ہیں، وہ ایسے مرد کا سوشل بایکھاٹ کریں جس نے ایسی حرکت کی ہو۔ کسی ایسے شخص کی حمایت و سرپرستی نہ کریں جو اس فعل کا مرتکب ہوا ہو۔ اگر وہ تاجر ہے تو اس کی دکان سے کوئی شخص سودا نہ خریدے، اور کوئی شخص اس سے تاجرانہ کاروبار نہ کرے۔ شاید آپ کہیں کہ ہماری عورتوں اور ہمارے مردوں میں ایسی ہمت اور جرأت کہاں ہے تو میں اس کا بھی جواب دے سکتا ہوں کہ جس معاشرے میں اخلاقی جرأت کا فقدان ہے اس کو کوئی نظام حکومت یا نظام عدالت درست

نہیں کر سکتا۔ رائے عامہ شدت کے ساتھ اگر کسی فعلِ قبیح کے خلاف ہو جائے تو بہت سے انسان اس سے باز آئیں گے۔ طلاق کے متعلق قرآنی احکام یہ ہیں کہ پہلے یہ قصہ اقربا و احباب اور برادری کے سامنے پیش ہو اور وہ معاملے کو سلجھانے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد بھی ایک شخص تلا ہوا ہے تو اس کو روک نہیں سکتے۔ دوسری شادی کے معاملے میں بھی اگر سوسائٹی یا ایک حد تک عدالت کو درمیان میں لایا جائے تو وہ بھی قرآنی منشا کے مطابق ہی ہو گا۔

سوال : اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے جو اکثر مفکرین اور مصلحین کا خیال ہے کہ حقیقت میں سارا مسئلہ معاشی مسئلہ ہے۔ تمام معاشی وسائل مرد کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ عورت معاشی لحاظ سے نہتی اور بے بس ہوتی ہے۔ جب تک یہ صورت رہے گی مرد غالب رہے گا اور عورت مغلوب اور محکوم رہے گی۔ جس کے ہاتھ میں پیسہ ہے وہ اپنی من مانی بات کرے گا اور جس کے پاس نہ کچھ ہے اور نہ کچھ حاصل ہونے کی توقع ہے وہ درست نگرہی رہے گی اور اسے سر تسلیم خم ہی کرنا پڑے گا۔ اگر عورت کے ہاتھ میں بھی کچھ ذرائع معاش ہوں تو اس کی خودداری بہت حد تک قائم رہ سکتی ہے؟

جواب : یہ نکتہ اسلامی بصیرت میں موجود تھا اس لیے اسلام نے اپنی شریعت میں یہ قابل قدر پہلو رکھا کہ عورت کو ورثہ بھی ملے اور وہ اپنا ہر بھی بوقت نکاح حسب حیثیت خود وصول کرے اس کی مالک رہے۔ از روئے اسلام عورت اپنے مال سے خود مختار نہ تجارت کر سکتی اور منافع حاصل کر سکتی ہے۔ شریعت حلقہ کو پیش کر سنے والے کو یہ معلوم تھا کہ انسان کا وقار وہ مرد ہو یا عورت بہت کچھ معاشی آزادی کے ساتھ وابستہ ہے۔ لیکن عورت کا فطری کام ایک اچھی مال بننا ہے اس کے جسم اور نفس کی تمام ساخت اس حقیقت کی شاہد ہے۔ عورت کا اصلی وظیفہ حیات یہ ہے کہ وہ شوہر کے لیے باعث تسکین ہو۔ صالح اولاد پیدا کرے اور اس کی تربیت میں اپنی قوتوں کا بیشتر حصہ صرف کرے۔ مردوں کی معاشی زندگی میں خواہ

مخواہ کی مساوات طلبی سے تمام قسم کے کاروبار میں شرکت اور وہ بھی اس انداز کی کہ عورت کو اپنے قطری فرائض سے بہت کچھ کنارہ کشی کرنی پڑے اچھے نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ لیکن اگر عورت کو علم و مہر حاصل ہو اور وہ اپنے فرائض زوجیت و امومت سے عہدہ برہ ہونے کے بعد اس سے معاشی فائدہ اٹھا سکے تو یقیناً عورت کا وقار اس سے بڑھ سکتا ہے اور اس کی بے بسی میں کمی آ سکتی ہے۔ علم و مہر رکھنے والی عورت اپنے نسوانی فرائض بھی بہتر طریقے سے سرانجام دے سکتی ہے اور نامساعد حالات میں معاش بھی پیدا کر سکتی ہے۔ ایسی مثالیں ہر جگہ ملتی ہیں کہ خاوند کی نالائقی کے باوجود عورت نے بال بچوں کی پرورش کا ذمہ لے کر ان کو سنبھال لیا، یا بیوہ ہو جانے کے بعد کاروبار سے یا کسی مناسب ملازمت سے اپنی عزت کو سنبھالے رکھا اور بچوں کی بھی اچھی تربیت کی۔ لیکن بے ضرورت خواہ مخواہ ہر قسم کی معاشی جدوجہد میں اپنی نسوانی قوتوں کو صرف کرنا اور اپنے نسوانی خواص و فضائل کو کھو بیٹھنا خود عورتوں کے حق میں خسارے کا سودا ہے۔

اپنے نسوانی فرائض میں خلل اندازی کے بغیر جو حصول معاش عورتوں کے لیے ممکن اور مناسب ہو اس کے ذرائع پیدا کرنا نہ صرف جائز بلکہ خاص حالات میں فرض ہو جاتا ہے۔

(ثقافت۔ جون ۱۹۵۵ء)

اسلام اور ضبط و لاوت

پاکستان کے خصوصی مسائل میں معاشی ہمواری، آباد کاری، رخصتے روزگاری، صحت عامہ، ترویج تعلیم و تربیت، حصول انصاف کی سہولت اور اخلاقی اقدار کا قیام وغیرہ ہیں۔ یہ سب کچھ انسانیت کا، لہذا عین اسلام کا، تقاضا ہے، اسلام کا تقاضا محض روزہ نماز نہیں۔ روزہ نماز زیادہ تر انہی انسانی تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ ان کے بغیر کوئی معاشرہ صالح نہیں ہو سکتا، اور معاشرہ صالح نہ ہو تو اسلام کا نعرہ اور دعویٰ ایک ذہنی فلسفے اور خوش کن شاعری سے زیادہ کچھ نہیں۔

لیکن یہ سارے مسائل ایسے ہیں جن کے حل کرنے کی ضرورت سے کسی مسلمان کو انکار نہیں۔ کوئی انسان کبھی یہ کہنے والا نہ ملے گا کہ ”بے روزگاری ضرور رہنی چاہیے۔ معاشی ہمواری کی کوئی ضرورت نہیں۔ آباد کاری بے کار ہے۔ تعلیم اور صحت کوئی ضروری چیز نہیں، اور عدل و انصاف اور اخلاقی اقدار غیر ضروری چیزیں ہیں۔“ ان مسائل میں دورائیں نہیں۔ لیکن اگر ”انضباط عائلی یا“ ضبط و لاوت“ کا لفظ زبان سے نکالیں تو یقیناً اس میں دورائیں سامنے آجائیں گی۔ ایک طبقہ اسے بالکل خلاف اسلام قرار دے گا اور دوسرا اس میں کوئی دینی مضائقہ نہ تصور کرے گا۔

یہ عجیب بات ہے کہ دوسرے تمام مسائل میں ہماری قوم یک زبان و ہم آہنگ ہے۔ لیکن جس چیز پر ان سارے مسائل کا ۸۰ فی صد حل موقوف ہے، اس میں قوم کی دورائیں ہیں۔ یوں تو ساری دنیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اکثر اقوام عالم کے لیے ایک انتہائی اہم مسئلہ بن گئی ہے اور اکثر ممالک میں لوگ اس پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ لیکن ہماری پاکستانی قوم نے ابھی اسے لائق توجہ بھی نہیں سمجھا ہے۔ یہاں کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ ولادت اور موت

کے متاثر میں بڑا بلی پڑ گیا ہے، اور دونوں میں کوئی توازن باقی نہیں رہا ہے جس کی وجہ سے آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اگر ہی ضرورت حالی جاری رہی اور اس پر کنٹرول نہ کیا گیا تو پاکستان کے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے جائیں گے اور معاش، آباد کاری، روزگار، صحت اور تعلیم وغیرہ کے سارے مسائل ہر روز بچیدہ سے بچیدہ تر ہوتے جائیں گے۔

اگر ہندوستان، چین، جاپان، ترکی، افغانستان، مصر، عرب، مراکش، ایران، شام، عراق وغیرہ سے لاکھوں کی تعداد میں زندہ اور اچھے مسلمان بھائی یہاں پاکستان میں آکر بسنا چاہیں تو حکومت پاکستان یقیناً ان پر پابندی لگائے گی اور جانے تنگ است و مردماں بسیار یا "یک انار و صد بیمار" کہہ کر انھیں آنے سے روک دے گی۔ لیکن یہی اگر کھوں کی تعداد میں "ہلک عدم" سے ہر ماہ تشریف لائیں تو ان کے لیے دروازہ کھلا رکھا جائے۔ کیا یہ تعجب کی بات نہیں۔

بلاشبہ کبھی آبادی بڑھانے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت جب کہ وسائل حیات وسیع تر ہوں، سہل الحصول ہوں اور اس کے مقابلے میں افراد کم تر ہوں۔ لیکن اگر معاملہ برعکس ہو تو عقلی و نقلی حیثیت سے بھی آبادی میں اضافہ کیے جانا کوئی دینی خدمت نہیں۔ ہر معاشرے اور ہر حکومت کا فرض ہے کہ وسائل حیات اور آبادی میں توازن قائم رکھے۔ اگر کوئی شخص ایک دو فرد پیدا کرے اور وہ معاشرے کے لیے اعلیٰ فرد ثابت ہوں تو یہ اس سے ہزار درجے بہتر ہے کہ بیسیں اولادیں پیدا کر کے امت محمدیہ میں ایسے افراد کا اضافہ کرے جن کو رہنے کے لیے مکان میسر نہ ہو۔ جن کی ضروریات زندگی پوری نہ ہو سکتی ہوں۔ جن کی صحت برقرار رہنے کا کوئی انتظام نہ ہو۔ جن کی تعلیم کا کوئی بندوبست نہ ہو اور جو اپنی آئندہ زندگی میں ورور کی ٹھوکریں کھاتے پھریں۔ بھیک مانگتے پھریں۔ چوریاں کرتے پھریں اور اپنی ذہنی و اخلاقی گراؤ سے سوسائٹی کو خراب کر کے ملک و قوم کو رسوا کریں۔ یہ نہ کوئی دینی خدمت ہے، نہ قومی اور ملکی۔ نہ اخلاقی، نہ معاشی اور سیاسی نہ عقلی، نہ عملی اور ذہنی۔

عہد نبوت میں ضبط ولادت کا ایک ہی طریقہ رائج تھا جسے "عزل" کہتے ہیں۔ اور اب اس کے کئی طریقے ایجاد ہو گئے ہیں۔ تفصیلات میں جاننا شاید تہذیب کے مطابق نہ ہو گا۔ اس لیے ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں۔ یہ نئے طریقے ایسے ہی ہیں، جیسے کسی مرض کی دوا عہد رسالت میں کچھ اور تھی اور اب بہت سے نئے علاج ایجاد ہو گئے ہیں۔ اگر نئے طریقہ علاج سے فائدہ اٹھانا خلاف سنت نہیں، اور یقیناً نہیں، تو ضبط ولادت کے نئے طریقوں سے فائدہ اٹھانے میں بھی کوئی دینی قباحت نہیں۔ اب ذرا "عزل" کے متعلق کچھ احادیث سنئے:

بخاری شریف میں حضرت جابر سے یہ روایت ہے کہ:

كُنَّا نَعْرِضُ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْقُرْآنُ
يُنْزَلُ

ہم عہد نبوت میں عزل کیا کرتے تھے اور قرآن نازل ہو رہا تھا یعنی اگر عدل کرنا جائز نہ ہوتا تو قرآن میں اس کی ممانعت ضرور آتی

حضرت ابوسعید خدری سے بخاری میں ایک دوسری روایت یوں ہے:

كُنَّا نَعْرِضُ فَمَا لَمَّا رَسُولُ اللَّهِ
صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ أَوْ
الْكِبْرَ لَتَفْعَلُونَ؟ قَالَهَا ثَلَاثًا مِنْ
نَسْمَةٍ كَأَنَّهَا إِلَى يَوْمِ الْقِيَمَةِ إِلَّا
هِيَ كَأَنَّهَا

ہم عزل کیا کرتے تھے۔ پھر حضورؐ سے اس بارے میں دریافت کیا تو حضورؐ نے تین بار پوچھا کہ کیا تم لوگ ایسا کرتے ہو؟ پھر فرمایا کہ قیامت تک جو روح آنے والی ہے وہ تو آکر ہی رہے گی۔

اس حدیث میں کچھ تعجب کا اظہار ہے اور کچھ حقیقت کا اظہار۔ یعنی آنے والی روح تو آکر ہی رہے گی۔ لیکن یہ ایسا ہی جیسے کہا جائے کہ "جسے مرنا ہے اس کی موت تو آکر ہی رہے گی" اس سے جس طرح یہ نتیجہ نہیں نکالا جاسکتا کہ کوئی بیمار ہو تو علاج نہ کیا جائے۔ اسی طرح اس فرمان سے کہ "آنے والی روح تو آکر ہی رہے گی" یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ ضبط ولادت ناجائز ہے۔ عدم جواز کے لیے سیدھا اور صاف طریقہ گفتگو تو یہی ہو سکتا تھا کہ "ایسا نہ کیا کرو اور اس سے باز آ جاؤ"۔ لیکن اس کی

ممانعت نہ کہیں قرآن میں ہے نہ کسی حدیث میں۔ بلکہ مسلم کی روایت میں تو صاف الفاظ یہ ہیں کہ:

کنا لعزل علی عهد رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم قبل غزہ ذاک
ہم لوگ عہد رسالت میں عزل کیا کرتے تھے
حضرت کو یہ اطلاع ملی مگر ہم لوگوں کو اس سے
مخبر نہ فرمایا۔

عام فقہانے صرف اتنی احتیاط رکھی ہے کہ آزاد (حورہ) زوجہ سے اذن سے کر
عزل کیا جاسکتا ہے۔ مگر امام شافعی اس کے لیے کسی اذن کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے
ہر کیف یہ مسلم ہے کہ عزل کی کوئی ممانعت نہ قرآن میں ہے نہ کسی حدیث میں
پس اگر عزل جائز ہے تو ضبط ولادت کے تمام نواہج و طریقہ بھی جائز ہی ہونے چاہئیں
عزل کا مقصد یہ ہے کہ جو ثمرہ حیات کو رحم میں نہ پہنچنے دیا جائے۔ خواہ اسے مار کر
ہو یا ضائع کر کے یا درمیان میں کوئی چیز حائل کر کے۔

اگر ایک جرثومہ حیات کو ضائع کرنا ناجائز ہوتا تو سرے سے وظیفہ ازدواج
ہی کو ناجائز قرار دے دیا جاتا۔ کیونکہ ہر بار کئی ارب جرثومہ حیات (Sperm)
ضائع ہوتے ہیں، اور استقرار حمل کے بعد تو بلاشبہ اربوں جرثومہ حیات ضائع
ہی جاتے ہیں۔ پس یہ یقینی طور پر جاننے کے باوجود کہ صرف ایک ہی جرثومہ انسان
بن سکتا ہے، اور وہ بھی قسمت سے جس کا ہمیں کوئی علم نہیں۔ سرے سے وظیفہ
زوجیت ہی کو ناجائز ہونا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات ضبط ولادت کا شمار واجبات شرعیہ
میں جوتا ہے۔ مثلاً اگر یہ معلوم ہو کہ استقرار حمل سے عورت کی زندگی خطرے
میں پڑ جائے گی تو اس ایک کی جان بچانے کے لیے اربوں جرثومہ حیات کا اتلاف
واجبات میں سے ہے نہ قرآن کریم میں ہے کہ:

وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللَّهَ
اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو۔ اللہ تم پر ہر ایک
کان بیکم وحیاً (۲۸:۴)

پس اگر ایک عورت کی جان بچانے کے لیے اربوں جراثیم حیات کو ضائع کرنا درست ہے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنی چاہیے کہ پورے معاشرے کو معاشی و معاشرتی تباہی سے بچانے کے لیے بھی ضبط و لاوت نہ فقط جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہے اور حکومت یا معاشرے کا فرض ہے کہ وہ ضبط و لاوت کے لیے تمام ممکن سہولتیں ہم پہنچائے۔ جو حکومت موجودہ افراد کا انتظام نہ کر سکتی ہو وہ کم از کم اتنا تو کر سکتی ہے کہ ان مشکلات میں مزید اضافے سے لوگوں کو بچائے۔

بعض حضرات ضبط و لاوت کی مخالفت اس آیت سے مستنبط فرماتے ہیں:

لا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ حَتّٰی يَكُنْ لَّكُمْ حَتْمٌ ۚ وَاُولٰٓئِكَ سَيُعَذِّبُ اللّٰهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ ذٰلِكَ ۙ
اپنی اولاد کو محتاجی کے خوف سے قتل نہ کرو
ان کو روزی ہم دیں گے اور تم کو بھی ہم ہی دیتے
ہیں۔ ان کو قتل نہ کرنا شدید غلطی ہے۔

(۳۱:۱۷)

اگر واقعی جراثیم حیات کو ضائع کرنا قتل اولاد ہے تو ہر وظیفہ زوجیت کے بعد والدین کو اپنی اربوں اولاد کے ضائع ہونے پر ماتم کرنا چاہیے۔ اور پھر اگر جراثیم حیات کو ضائع کرنا بھی قتل اولاد کے جرم میں داخل ہوتا تو قرآن عزل کرنے والوں کو قاتلین اولاد قرار دیتا، اور بھی تو حضور نے عزل کو قتل اولاد قرار دیا ہوتا۔ جب یہ سب کچھ نہیں تو اپنی طرف سے قتل جراثیم کو قتل اولاد بنانے کا کسی کو کیا اختیار ہے، اور پھر ان انبیاء و اولیاء کے متعلق کیا فتویٰ لکایا جائے گا جنہوں نے تہذیب کی زندگی گزار لی؟ کیا ان کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اربوں ہونے والے انسانوں کو وجود میں آنے سے روک دیا؟ حقیقت یہ ہے کہ ضبط و لاوت قتل اولاد سے بالکل جداگانہ شے ہے۔ قتل اولاد تو اولاد ہونے کے بعد ہوتا ہے اور ضبط و لاوت وجود اولاد سے پیشتر کا احتیاطی عمل ہے۔

یہ صحیح ہے کہ آباؤ کی زیادہ ہو جانے کے بعد قدرت امراض یا وبا یا جنگ مسئلہ

کر کے توازن پیدا کر لیتی ہے۔ لیکن قدرت کو یہ توازن پیدا کرنے کا موقع بہم پہنچانا کون سی نیکی ہے؟ انسانوں کو پیدا کر کے جنگ یا دبا سے ختم کرانا زیادہ بہتر ہے یا اس سے پہلے ہی جراثیم حیات کو ختم کر دینا؟

یہاں ایک ضروری نکتہ یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ضبط ولادت سے مراد صرف جراثیم زندگی یعنی ماؤہ کی افشاعت ہے۔ استقرار حمل کے بعد اسے ساقط کرنا ایک مجرباً فعل ہے۔ اس کو اگر قتل اولاد نہ بھی قرار دیا جائے تو قتل اولاد سے اس کی سرحدیں ضرور ملتی ہیں۔ ماؤہ تولید کے کسی جزو سے متعلق یقینی طور پر انسان بن جانے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن قرار یافتہ حمل کے متعلق انسان بننے کا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔ بجز اس کے کہ وہ کسی مرض کی وجہ سے بلا ارادہ ساقط ہو جائے۔ ایسے مواقع پر اسے اسقاط سے بچانا انسانی فرض ہے، اور وہ بھی صرف اس آسکنے والی روح ہی کی خاطر نہیں، بلکہ حاملہ کی جان کی خاطر۔ یہ حقیقت کون نہیں جانتا کہ جنین کا اسقاط و سقوط، یعنی خود بخود گرنا یا عمدہ اُگرانا، دونوں ہی عورت کے لیے سخت مضر ہیں اور دونوں کی زندگی کا تقاضا اسے محفوظ رکھنا ہے۔ اس لیے ضبط ولادت میں اسقاط جنین کے جواز کا ادنیٰ سے ادنیٰ شائبہ بھی نہیں پیدا ہوتا۔

اصل قتل وہی ہے جو زندہ پیدائش کے بعد کیا جائے۔ عربوں میں کہیں کہیں اس قسم کا رواج تھا جس کی قرآن نے واضح ممانعت فرمائی۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب تین وجہ سے قتل اولاد کیا کرتے تھے:

۱۔ معاشی تنگی۔ اس کے لیے قرآن نے فرمایا کہ "لا تقتلوا اولادکم خشية

املاق۔"

۲۔ خود ساختہ شرم و حیا۔ اس کا تعلق اولاد اناث یعنی لڑکیوں سے تھا جس کا ذکر قرآن نے یوں کیا ہے: "واذا لبش احدہما بالانثی ظل وجہہ مسوداً و هو کظیم یتواری من القوم من سوء ما لبش به ایسکھ علی ہون امیل^۱ فی التراب الاساء ما یحکمون۔" (۱۶: ۵۸-۵۹) یعنی ان میں کسی کو جب لڑکی

پیدا ہونے کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ اندر ہی اندر گھٹنے لگتا ہے۔ اس بشارت سے اسے جو رنج پہنچتا ہے اسے وہ لوگوں سے چھپاتا پھرتا ہے، اور سوچتا ہے کہ اس ذلت کو اٹھائے پھرے یا اسے بیوقوف و ذلیل کر ڈالے۔ آگاہ رہو کہ ان کے یہ منصوبے بہت ہی بُرے ہیں۔

اور اسی چیز کا ذکر اس آیت میں بھی ہے: **وَاِذَا الْعَوْدُ ذُكِرْتُ لِلْغَنَةِ قَتَلَتْ** ذنب قتل (۹۰:۸۱) یعنی زندہ درگور کی ہوئی بچیوں سے یہ پوچھا جائے گا کہ انھیں کس جرم میں قتل کیا گیا تھا۔

۳۔ دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے اولاد کو بھینٹ چڑھانا۔ یہ کسی ایک صنف کے ساتھ مخصوص نہ تھا۔ ذکور و انث دونوں کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا جاتا تھا۔ قرآن مجید میں اسی کا ذکر اس آیت میں ہے: **وَكُنَ الْكَافِرُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ قَتَلَ** اولاد دھندلے شکر کا وُھد (الحجہ: ۱۲۸) یعنی یونہی بہتیرے مشرکوں کی نگاہ میں ان کے معبودوں نے قتل اولاد کو ایک قابلِ قدر کام بنا کر رکھ دیا تھا۔

عربوں میں یہی تین طریقے قتل اولاد کے رائج تھے اور ان سب کا تعلق اس اولاد سے تھا جو زندہ پیدا ہو چکی ہو۔ مادہ تولید کو ضائع کرنے سے ایک کا بھی تعلق نہیں تھا اب دیکھیے بات کا نقشہ یوں بنا کہ

ایک طرف زندہ اولاد کو قتل کیا جاتا ہے اور دوسری طرف عزل و ضبط و ولادت کیا جاتا ہے۔ دونوں فعل اللہ اور رسول کے سامنے ہیں۔ مگر ایک کے متعلق اللہ اور رسول دونوں واضح اور غیر مبہم ممانعت کرتے ہیں اور دوسرے کے متعلق نہ قرآن میں کوئی حکم آیا ہے نہ حدیث میں۔ فرمائیے دونوں کے فرق کے بارے میں اب آپ کا کیا فیصلہ ہے؟ کیا اب بھی آپ ضبط و ولادت کو قتل اولاد قرار دیں گے؟

ہمیں ایک حقیقت کو اور بھی واضح کرانے کی اجازت دیجیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ موجودہ حالات میں بے شمار اولاد پیدا کرنا قتل اولاد سے کم سنگین جرم نہیں۔ ایسی اولاد پیدا کرنا جس کی دینی، جسمانی، اخلاقی، روحانی، ذہنی، علمی، عملی، معاشی اور

معاشری تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو، دینی، اخلاقی اور عقلی لحاظ سے ناقابل معافی جرم ہے۔ عرب کے وحشی جس زندگی کے ساتھ اپنی اولاد کو قتل کرتے تھے اس کی تکلیف چند منٹ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ موت ساری تکلیف کا خاتمہ کر دیتی تھی۔ لیکن جس طرح کے بے سہارا بچے ہماری نان شبینہ کی محتاج بھوکے اور تنگی قوم کے اکثر افراد پیدا کر رہے ہیں وہ صحیح معنوں میں زندہ درگور کرنے کے مترادف ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ اس لیے کہ ایسی اولاد زندگی بھر موت کی ہچکیاں لیتی رہتی ہے اور پھر بھی نہیں مرتی۔ وہ ”لا یموت فیہا ولا یحیی“ کی روح فرسا کیفیت میں زندگی کے دن گزارتی ہے۔

معاشری تنگی کی وجہ سے عزل یا ضبط ولادت کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جو احمد بن حنبل نے اسامہ بن زید سے یوں روایت کی ہے:

ان رجلاً جاء الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال انی اعزل عن امراتی فقال صلی اللہ علیہ وسلم لم تفعل ذالک ؟ فقال الرجل اشفق علی ولداھا او اولادھا۔ فقال علیہ السلام لو کان ضاراً فی فارس والروم۔

ایک شخص نے حضورؐ کے پاس عرض کیا کہ میں اپنی عورت سے عزل کرتا ہوں۔ حضورؐ نے پوچھا کہ ایسا کیوں کرتے ہو؟ عرض کیا کہ اس کی اولاد کا خطرہ محسوس کرتا ہوں۔ حضورؐ نے فرمایا اگر یہ مضر ہو تا تو فارس و روم کے لیے بھی مضر ہوتا۔

امام شوکانی ”نیل الاوطار“ میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ومن الامور التي تحصل علی العزل القراد من كثرة العیالی۔ چیز کثرت اولاد سے بچنا بھی ہے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ معاشری تنگی میں مزید اضافہ ہونے

کے اندیشے سے ضبط ولادت پر عمل کرنے میں کوئی شرعی قباحت نہیں۔ چنانچہ ایک بار حضرات علیؑ و زبیرؓ و سعیدؓ اور دیگر صحابہ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے تھے کہ

عزل کا ذکر چھڑا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ: ”لا بائس به“ اس میں کوئی حرج نہیں۔ ان حقائق کے بعد چند اور ضروری باتیں بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ”نسل کشی“ کی فراوانی کو روکنے کا مطلب ”نسل کشی“ نہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ موت و ولادت میں ایک توازن پیدا کیا جائے۔ موت و ولادت ہی میں نہیں بلکہ اسبابِ حیات اور آبادی میں بھی توازن کو برقرار رکھا جائے، اور صرف اسی قدر کافی نہیں بلکہ جو آبادی زندہ موجود ہے اس کو زندہ رکھنے کے لیے تمام وسائلِ حیات مہیا کیے جائیں، اور تمام سامانِ زندگی میں خاطر خواہ اضافہ کر کے معاشی تنگی کو دور کیا جائے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کا علاج تنہا جن روک بابر تھکسٹرو نہیں۔ ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کرنی لازمی ہے کہ سامانِ زیست کو فراوان کیا جائے ضبطِ ولادت تو کوئی گناہ نہیں مگر زندوں کے لیے اسبابِ زیست مہیا نہ کرنا بلاشبہ گناہِ عظیم ہے۔ اور اس کی سرحدیں قتلِ انسان سے ملی ہوئی ہیں۔

ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ مصر کی اخوان المسلمون کے ایک معزز رکن ابھی اٹھویں نے ”تحدیدِ نسل“ پر ایک رسالہ شائع کیا ہے جس کا نام ہے ”المرأة بین البیت والمجتمع“ (عورت گھر اور سوسائٹی کے درمیان)۔ اس میں بھی ان احادیث کے حوالے موجود ہیں جو ابھی ہم نے نقل کیے ہیں اور مؤلف مدوح نے ضبطِ ولادت کو بالکل جائز قرار دیا ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اسے ضروری بھی بتایا ہے۔ اس کے علاوہ خالد محمد خالد نے بھی ایک رسالہ لکھا ہے جس کا نام ہے ”من هنا ننبت“ (ہم یہاں سے شروع کرتے ہیں)۔ اس میں اٹھویں نے بھی خولی کی تائید کی ہے۔ اس رسالے کی آٹھ اشاعتیں ہو چکی ہیں۔ اس میں اٹھویں نے ایک استدلال یہ بھی کیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا پڑھتے تھے کہ

”اللهم انی اعوذ بک من جهد البلاء“ یعنی اے اللہ میں ”جہدِ بلا“

سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ حضورؐ سے دریافت کیا گیا کہ یہ ”جہدِ بلا“ کیا چیز ہے؟ تو حضورؐ نے فرمایا کہ ”قلۃ المال و کثرة العیال“ یعنی معاشی تنگی اور اولاد کی زیادتی۔

مصر سے اور پھر انخوان المسلمون کے ایک رکن کے قلم سے ضبط ولادت کا فتویٰ بلاوجہ نہیں۔ وہ ایسے کئی معاملات میں ہم سے آگے ہیں اور زمانے کے تقاضے انہیں سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ نسل انسانی کی افزائش کا مسئلہ ان کے سامنے بھی ہے اور اگر آپ غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ مصر کی گزشتہ آویزش جنگ کا اصلی سبب بھی یہی افزائش نسل تھی۔ اسی نسلِ افزائش نے مصریوں کو وسائلِ معاش اور آبادی کے درمیان توازن پیدا کرنے پر مجبور کیا۔ ادھر تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور ادھر وسائلِ معاش محدود۔ وہ کرتے تو کیا کرتے؟ اس کا حل انہوں نے یہ نکالا کہ پیداوار بڑھانے اور دولت میں اضافہ کرنے کے لیے انہوں نے "اسوان بند" تعمیر کرنے کی اسکیم تیار کی۔ اس میں رکاوٹ پیدا ہوئی تو یہ خلا یوں پر کیا کہ نرسونز کو قومی کر اپنی آمدنی میں اضافہ کرنے کی صورت نکالی جس کا نتیجہ جنگ و خونریزی کی شکل میں ظاہر ہوا۔ افزائشِ نسل کی یہ بچیدگیاں اہل مصر اور انخوان المسلمون کے سامنے تھیں، اس لیے انہوں نے اس بڑھتی ہوئی آبادی پر قابو پانے کے لیے ضبط ولادت یا تحدید نسل پر زور دیا۔ ہمارے ہاں کی مذہبی جماعتیں ذرا دیر میں مسائل پر غور کرتی ہیں، اس لیے یہاں اس پر غور ہی نہیں کیا گیا اور جہاں غور کیا گیا وہاں کچھ اٹا غور کیا گیا اور حقائق پر غور کرنے کی بجائے واعظانہ انداز اختیار کیا گیا کہ "جو پیدا ہوتا ہے وہ اپنی روزی سے کراتا ہے لہذا اس کی فکر نہ کرو۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ مادہ تولید بھی تمہاری ہونے والی اولاد ہے۔" وغیرہ وغیرہ۔

مجبب یہ ہے کہ ہمارے بعض اہل تقدس نے حالتِ اضطرار میں کئی طرح کی غلط کاریوں کو بڑی فراخ دلی سے جائز قرار دیا ہے، اور جائز ضبط ولادت جس کا جوا صریح احادیث سے ثابت ہے قومی اضطرار کی حالت میں بھی ان کے نزدیک جائز نہیں۔ ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ ضبط ولادت کا طریقہ معلوم ہونے کے بعد مرد و زن کے ناجائز تعلقات کی بڑی کثرت ہو جائے گی کیونکہ ناجائز ولادت کا خوف نہیں رہے گا۔ ٹھیک ہے لیکن اس کا علاج بدکاری کو روکنا ہے نہ کہ ضبط ولادت کی مخالفت

کرنا۔ بدکاری تو اب بھی ہوتی ہے اور کرنے والے اپنا راستہ اب بھی نکال لیتے ہیں۔ اسے روکنے کی تدبیریں بھی ضرور کرنی چاہئیں۔ لیکن ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ ضبط و لاوت میں تو صرف ایک خرابی ہے یعنی ناجائز تعلق کا احتمال، اور بدکاریوں کے ضبط و لاوت نہ کرنے میں دو خرابیاں ہیں، بدکاری بھی اور ناجائز و لاوت بھی۔ اور اس کے نتائج یہ ہوتے ہیں کہ بعض عورتیں تو مارے جیا کے خودکشی کر لیتی ہیں، اور بعض گھر سے نکل جاتی ہیں اور بعض اسقاط کر کے ایک جان ضائع کرٹی اور اپنی جان خطرے میں ڈال دیتی ہیں۔ بعض لوگ بدنامی کے ڈر سے بچے کو کہیں پھینک آتے ہیں یا صندوق میں رکھ کر ریل کے ڈبے میں ڈال دیتے ہیں۔ اور بعض اسے مار کر قتل نفس کے مرتکب ہوتے ہیں، اور اگر قسمت سے وہ نومولود زندہ بچ گیا تو وہ دنیا پر ایک ایسا بوجھ ہوتا ہے جو تنہا بوجھ ہی نہیں ہوتا بلکہ رسوا، بدنام، ہدف مباحن، احساس کمتری کا شکار اور سوسائٹی کا ایک ذلیل فرد بن کر رہتا ہے۔ اگر "اہون البلیتین" کا مسئلہ بھی مسلم ہے تو خود فیصلہ کر لیجئے کہ ان دو بدکاریوں میں کون سی بدکاری کمتر ہے؟ بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنا بھی ضروری ہے اور ضبط و لاوت میں بدکاری بڑھنے کا خطرہ بھی ہے۔ اب دیکھنا صرف یہ ہے کہ "اہون البلیتین" کی کیا ہے؟ خرابی تو ہر اس بات میں ہوگی جو انسان تجویز کرے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ کم خرابی کس میں ہے؟ انسانی فطرت تو یہ ہے کہ خدا کی تجویز کردہ عبادت یعنی نماز تک کو کچھ لوگ ریاکاری کا آلہ بنا لیتے ہیں اور نماز کا بوریا بوسے ریا کا مصدر بن جاتا ہے۔ ایسے ہی دکھاوے کی نماز ادا کرنے والوں کی نسبت قرآن کریم "ویل للمصلین" کہتا ہے یعنی انہوں میں ایسے نمازیوں پر اور ان کی نماز پر۔ انسان کی ہنر کے لیے خواہ خدا اور اس کا رسول کچھ تجویز کریں یا انسانی عقل اصلاح حال کے لیے کوئی منصوبہ پیش کرے اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا احتمال ہر حالت میں پایا جاتا ہے۔ حیات انسانی کے اندر ضروری اصلاحات کو محض اسی خطرے کی وجہ سے نہیں روک سکتے کہ بعض لوگ ان سے ناجائز فائدہ اٹھائیں گے۔ وثقافت۔ اپریل ۱۹۵۷ء

ملفوظات رومی

مترجم عبدالرشید

یہ مولانا جلال الدین رومی کی ”فیہ ما فیہ“ کا اردو ترجمہ ہے۔ ”فیہ ما فیہ“ کوئی باقاعدہ تصنیف نہیں بلکہ مولانا کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جو آپ کے صاحبزادے سلطان بہاؤ الدین نے آپ کی مختلف مجالس میں محفوظ کیے۔ مشنوی اور دیوان شمس تبریز کو سمجھنے کے لیے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

6/75 روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ

کی مفصل فہرست کتب طلب کرنے پر
مفت روانہ کی جائے گی۔ اپنا نام اور پتہ
نہایت صاف اور خوشخط تحریر کریں۔
— سیکرٹری

مولانا جلال الدین رومی پر خلیفہ عبدالرحیم کی فکر انگیز کتابیں

(۱)

حکمت رومی

یہ ایک بلند پایہ تصنیف ہے جو ماہیت نفس انسانی ، عشق و عقل ، وحی و الہام ، وحدت وجود ، احترام آدم ، صورت و معنی ، عالم اسباب ، اور جبر و قدر جیسے اہم ابواب پر مشتمل ہے ۔ خلیفہ صاحب نے مولانا کے افکار کا دوسرے حکما کے خیالات سے موازنہ کرتے ہوئے ایسی حکیمانہ تشریح کی ہے جو عصر حاضر کے تقاضوں کو محسوس کرتے ہوئے ذہن و فکر کو اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے اور ان مباحث کے متعلق صحیح اسلامی نقطہ نظر کو واضح کرنے میں مفید و معاون ثابت ہوں گے ۔

3/50 روپے

(۲)

تشبیہات رومی

خلیفہ عبدالرحیم مرحوم کی یہ آخری کتاب ہے ۔ اس میں انہوں نے بسط و تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ رومی ما لباض فطرت مہک اور عامۃ الوجود تشبیہوں سے کام لے کر فلسفہ حیات اور کائنات روح کے اسرار و غوامض کس آسانی سے حل کر دیتا ہے ۔ موضوع کی بلندی بجائے خود دعوت فکر ہے ، لیکن انداز بیان کی دلکشی اور سحر طرازی نے الفاظ میں جان ڈال دی ہے ۔

8/- روپے

ادارہ ثقافت اسلامیہ ، کلب روڈ ، لاہور

سرورق زرین آرٹ پریس لاہور میں چھپا